داستان
سیف الملوک

جھیل سیف الملوک سے وابستہ رومانی داستان

احمد حسین مجاھد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیف الملوک

(جھیل سیف الملوک سے وابستہ رومانوی داستان)

احمد حسین مجاہد

we

striving for peace and justice

Contact: 0332-9461234

☆

اروندھتی رائے نے اپنے شہرۂ آفاق ناول THE GOD OF SMALL THINGS میں لکھا ہے۔

''عظیم داستانوں کا سب سے بڑا طلسم یہ ہے کہ اُن کا کوئی طلسم نہیں ہوتا۔ عظیم داستانیں وہی ہیں جنہیں آپ پہلے بھی سُن چکے ہوتے ہیں مگر دوبارہ سننا چاہتے ہیں۔ اِن داستانوں میں آپ کسی بھی دروازے سے داخل ہو سکتے ہیں اور اطمینان سے اِن میں رہ سکتے ہیں۔ وُہ کسی سنسنی کا سہارا لے کر آپ کو فریب نہیں دیں گی نہ ہی کسی خاص طرح کے کلائمکس سے آپ کو چونکائیں گی۔ ہم جانتے ہیں کہ اب کیا ہوگا یا آخر میں کیا ہوگا، پھر بھی ہم انہیں سنتے رہتے ہیں، اِس طرح جیسے کچھ بھی پتہ نہ ہو۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ ایک دن مر جانا ہے پھر بھی جیے چلے جاتے ہیں۔ اِس طرح جیسے کبھی مرنا ہی نہیں۔ عظیم داستانوں میں ہمیں پتہ ہے کون جیے گا، کون مرے گا، کس کو کس کا پیار ملے گا۔ مگر ہم ہیں کہ یہ سب بار بار سننا چاہتے ہیں''

(تسطیر، شمارہ 8-7)

☆

ماں کے نام

خدا نے لاج رکھی ماں کے ایک آنسو کی
ملا تو گھر میں ملا چشمۂ بقا مجھ کو

داستانِ سیف الملوک کا تیسرا کردار

(ڈاکٹر افتخار مغل)

جھیل سیف الملوک سے وابستہ رومانوی داستان کے بہت سے versions ہیں۔ پنجابی/ پہاڑی زبان کے عظیم کشمیری شاعر حضرت میاں محمد بخشؒ کی منظوم داستان سے لے کر آپ کے ہاتھوں میں موجود کہانی تک ''سیف الملوک'' سحر ہی سحر ہے، حسن ہی حسن ہے، تجسس ہی تجسس ہے لیکن ہمیں سیف الملوک اور وادیِ سیف الملوک (وادیِ کنہار) سے وابستہ رومان اس وقت اور بھی سحر انگیز لگنے لگا جب یہ انکشاف ہوا کہ لمحۂ موجود کے ایک محبوب اور صاحبِ توفیق شاعر احمد حسین مجاہد کا تعلق بھی اسی وادیِ حسن و عشق سے ہے۔

احمد حسین مجاہد کو خدا نے شاعری کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ مجاہد بیسویں صدی کے آخری دھے کی اتنی توانا شعری آواز ہے جس نے احمد حسین مجاہد کے شہر بالاکوٹ سے لے کر بھارت کے شہر احمد آباد تک شاعری کے ہر سنجیدہ قاری کو چونکا دیا ہے لیکن مجھے اِس بات نے چونکا دیا ہے کہ مجاہد نے ایک لوک داستان بھی لکھ دی!

ہر لوک داستان اپنی دیو مالائی فضا کی کلاسیکیت کی بنائ پر مسحور کُن تو ہوتی ہی ہے لیکن دنیا میں ایسی لوک داستانیں بہت کم ہیں جنہیں ''سیف الملوک'' جیسا زندہ و پائندہ اور موجود و مسعود حوالہ بھی نصیب ہو اور میاں محمد بخشؒ اور احمد حسین مجاہد جیسے صاحبِ توفیق داستان گو بھی میسر ہوں۔

احمد حسین مجاہد نے اپنے سحر انگیز اور شاعرانہ بیانیے کے جادو سے سیف الملوک کی رومانویت کو اور زیادہ خوبصورت اور پُر تجسس بنا دیا ہے۔ یہ خوبصورت داستان جہاں اپنی مستحکم لوک روایت کی بنا پر زندہ جاوید رہے گی وہیں اس کو آراستہ و پیراستہ اور تر و تازہ رکھنے میں احمد حسین مجاہد کے اسلوب کی تر و تازگی بھی ایک ریفرنس کی طرح یاد رہے گی۔ یہ داستان اگر خیالی بھی ہے تو احمد حسین مجاہد کے بیان کا سلیقہ اِس کو

حقیقی بنا گیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ شہزادہ سیف الملوک اور اُس کی محبوبہ بدیع الجمال اب بھی اُس پہاڑی کھوہ کے اندر موجود ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو یقیناً اُن کے لیے یہ ایک اچھی خبر ہے۔ مجاہد نے لکھا ہے کہ آج بھی اس وادی میں بدیع الجمال کے جسم کی خوشبو اور سیف الملوک کے سانسوں کی مہک رچی ہوئی ہے۔ اب اِس وادی میں کہانی کے اِن دو مرکزی کرداروں کی ان خوشبوؤں کے ساتھ ایک تیسرے کردار کی خوشبو بھی رچ گئی ہے۔ یہ تیسرا مرکزی کردار اِس کہانی کا راوی احمد حسین مجاہد ہے !

سارے شہر میں جشن کا سا سماں تھا۔لوگ ناچتے گاتے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔جگہ جگہ کھیل تماشا ہو رہا تھا۔گھروں کے دریچوں اور بالکونیوں میں چراغوں کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔لگتا تھا جیسے ہر شخص مئےعشرت کے کئی کئی جام پیے ہوئے ہے۔میراثیوں اور رقاصاؤں کی ٹولیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔منادی شہر کے چوراہوں میں بآوازِ بلند اعلان کر رہے تھے کہ بادشاہِ معظم کے ہاں ولی عہد پیدا ہونے کی خوشی میں جشن کا یہ سماں پورے ایک ماہ تک جاری رہے گا۔ یہ نوید جاں فزا سن کر عوام الناس کے جوش وخروش میں اور بھی شدت آ رہی تھی۔کہیں دھمالیں پڑ رہی تھیں، کہیں مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی اور کہیں ڈھول باجے بج رہے تھے۔لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ شاہی محل کی طرف سرک رہا تھا۔اِس ہجوم میں عورتیں، بچے، بوڑھے غرض ہر عمر کے لوگ تھے اور سبھی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔شاہی محل بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ پٹاخے چھوڑے جا رہے تھے، سازندے خوشی کی دھنیں بجا رہے تھے۔بھانڈ اور مسخرے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ایک طرف فقیروں میں سونے چاندی کے سکے بانٹے جا رہے تھے۔حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنے والا عملہ الگ اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ناؤ نوش کے سبھی اسباب مہیا تھے۔بُھنا ہوا نمکین گوشت جو امرا کو بھی کبھی کبھی نصیب ہوتا تھا، آج فقیروں اور محتاجوں کی بھی دسترس

میں تھا۔غرض طرح طرح کی نعمتیں بادشاہ کے حکم سے عوام کی تواضع کی خاطر موجود تھیں۔
شاہی محل کے سامنے کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے باغ میں آج ایک طرفہ بہار آئی ہوئی تھی۔ایسی بہار شاید ہی کسی باغ کو نصیب ہوئی ہو!

رنگ و خوشبو اور روشنی میں نہائی ایسی رات چرخِ کہن نے پہلے شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔
دربار میں وزرائ، امرأ اور عمائدین جمع تھے۔بادشاہِ مصر عاصم بن صفوان اپنے تخت پر جلوہ افروز تھے اور مبارک باد دینے والوں میں حسبِ منصب تحفے تحائف تقسیم فرمارہے تھے۔
آج اُن کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ہزاروں منّتیں ماننے اور کئی برسوں کے انتظار کے بعد خدا نے انہیں شہزادے کی صورت میں ایسی نعمت عطا فرمائی تھی کہ جس کا وُہ جتنا بھی شکر ادا کرتے، کم تھا۔

بادشاہ عاصم بن صفوان کو دینے والے نے دنیا کی ہر نعمت عطا کر رکھی تھی۔دریائے نیل کے دونوں اطراف میں دور تک پھیلی ہوئی سلطنت، دوسرے بادشاہوں کے لیے باعثِ رشک خزانہ، جری فوج جس کی دھاک مشرق و مغرب میں ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی، دانش منداور قابلِ اعتبار وزرا، غلام اور کنیزیں، محبت کرنے والی رعایا، سبھی کچھ تو تھا اس کے پاس لیکن اس کی زندگی میں ایک ایسا خلا تھا جسے بھرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔وہ اسی فکر میں کڑھتا رہتا تھا کہ اس کے بعد اس کی اس وسیع سلطنت کا وارث کون ہوگا۔کون ہوگا جو اس بھرے خزانے کو اسی کی طرح عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرے گا۔

رات کے پچھلے پہر جب محل پر سکوت طاری ہوتا، وہ اکثر اٹھتا اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا اور یہی التجا کرتا کہ مولا! تو نے مجھے سب کچھ عطا فرمایا ہے، میرے پاس

کسی چیز کی کوئی کمی نہیں، اب مجھے ایک وارث بھی عطا فرما دے۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ بادشاہِ مصر کی اکثر راتیں اس کے اشکوں سے معطر رہتی ہیں۔دیکھنے والے تو بس یہی سمجھتے تھے کہ بادشاہ کے پاس ہر وہ چیز موجود ہے جس کی تمنا کی جاسکتی ہے لیکن جو عاصم بن صفوان کے دل پر گزرتی تھی، وہ جانتا تھا یا اس کا خدا۔

آخرِ کار خدا نے اس کی ساری دعائیں سن لی تھیں اور اسے ایک وارث عطا کر دیا تھا۔آج تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔

محل میں کنیزیں بھاگتی پھرتی تھیں۔غلام گردشوں میں آج سوا رونق تھی۔خواجہ سرا اور غلام مہمانوں کی خاطر داری میں مصروف تھے۔ملکہ عالیہ اپنے پہلو میں لیٹے نومولود کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔شہزادے کی آمد نے اُن کی زندگی کو کتنا بامعنی بنا دیا تھا، اِس کا احساس اُن کے سوا کسی اور کو کیا ہو سکتا تھا۔اُن کے جی میں آتا تھا کہ شہزادے کو اپنے دل کے جھولے میں سلا کر اُسے ماماتا بھری وُہ لوری سنائیں جو ساری زندگی شہزادے پر سایہ فگن رہے۔

اِس تمام ہنگامے سے الگ محل کے ایک کمرے میں بیٹھا جوتشی مسلسل زائچے بنا رہا تھا اور ستاروں کی خفیف سی حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔صبح اُسے بادشاہ کے حضور پیش ہو کر نومولود شہزادے کے آئندہ کو آئینہ کر کے بادشاہ سلامت کے روبرو رکھنا تھا۔جوتشی کے من میں بس ایک ہی بات تھی کہ کہیں کسی برج کا کوئی ستارہ اُس کے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دے۔

☆

بادشاہ سلامت کا حکم ملتے ہی جوتشی نے اپنے بنائے ہوئے سارے زائچوں کو یکجا کیا اور مؤدب انداز میں سر جھکائے وزیرِ خاص کے کارندے کے پیچھے ہولیا۔ بادشاہ کے حضور پہنچ کر جوتشی کورنش بجالایا اور اشارہ پا کر بادشاہ کے قدموں میں بچھے قالین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے ایک پل کے لیے جوتشی کو دیکھا اور پھر بظاہر لاتعلق سے ہو گئے۔

وزیرِ خاص بادشاہ سلامت کے دائیں طرف اپنی مسند پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے جوتشی کو بولنے کا اشارہ کیا لیکن اِس سے پہلے کہ جوتشی کچھ کہتا، بادشاہ سلامت کو پڑوسی ملک کے بادشاہ کے ایلچی کی آمد کی اطلاع پہنچی۔ اُسے فوری طور پر اذنِ باریابی دیا گیا۔ ایلچی نے پورے سفارتی آداب کے ساتھ اپنے ملک کے بادشاہ کا پیغام اور تحائف نذرِ بادشاہ کیے۔ بادشاہ نے تحفے میں آئی ہوئی تلوار میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور حکم دیا کہ ایلچی کو تین دن تک شاہی مہمان کی حیثیت سے یہیں ٹھہرایا جائے۔ ایلچی اِس ذرہ نوازی پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔

ایلچی کی رخصتی کے بعد وزیرِ خاص نے ایک بار پھر جوتشی کو بولنے کا اشارہ کیا۔ جوتشی نے بادشاہ اور شہزادے کی درازیِ عمر کے ساتھ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

''یہ نہایت ہی نیک شگون ہے کہ اِس موقع پر جب مجھے حضور کے سامنے شہزادے کے مستقبل کے بارے میں اپنی گزارشات رکھنی ہیں، پڑوسی ملک سے حضور کو دیگر تحفوں کے ساتھ ایک تلوار بھی

بھیجی گئی ہے۔ جہاں پناہ! میں اِس گراں قدر تحفے کی رعایت اور اپنے علم وحساب کے مطابق شہزادے کا نام ''سیف الملوک'' تجویز کرتا ہوں۔ اگر بادشاہ سلامت اِس نام کو پسند فرمائیں تو گویا ایک گنجِ بے بہا میرے ہاتھ آجائے''

شاہ عاصم نے وزیرِ خاص صالح بن حمید کی طرف دیکھا، گویا مشورہ چاہتے ہوں۔ وزیرِ خاص کہ بادشاہ کے مزاج آشنا بھی تھے بادشاہ کے من کی بات فوراً بھانپ گئے اور عرض کی:

''جہاں پناہ! نام تو خوب ہے، اتنا خوب کہ بس۔ لگتا ہے جوتشی کے من میں یہ نام خدا نے ڈالا ہے''

یہ سُن کر بادشاہ کے چہرے پر سپیدۂ سحر کی سی روشنی پھیل گئی۔ انہوں نے فوراً حکم دیا کہ شہر میں منادی کر دی جائے کہ شہزادے کو آئندہ شہزادہ سیف الملوک کے نام سے پکارا جائے۔ وزیر خاص نے سر کو جھکاتے ہوئے عرض کی کہ حکم کی تعمیل ہوگی۔ بادشاہ سلامت نے اپنے دائیں طرف پڑی ہوئی طشتری میں سے سونے چاندی کے سکوں کی ایک تھیلی اُٹھا کر جوتشی کے سامنے پھینک دی۔ جوتشی نے ذرا سی دیر اپنا سر بادشاہ کے پیروں پر رکھ دیا اور پھر تھیلی اٹھا کر اپنے زانو تلے رکھتے ہوئے گویا ہوا:

''جہاں پناہ! شہزادہ سیف الملوک حسن و جمال اور قوت وشجاعت میں لاثانی ہوگا۔ جو کام کئی افراد مل کر نہیں کر پائیں گے ، اکیلا شہزادہ بحسن وخوبی سرانجام دے دے گا۔''

بادشاہ نے سکوں کی اور ایک تھیلی فرش پر پھینک دی جسے جوتشی نے حسبِ سابق

پورے ادب آداب کے ساتھ اٹھا کر ایک مرتبہ پھر سلسلہ کلام شروع کیا:

’’جہاں پناہ! چار دانگ عالم میں شہزادے کے حسن اور شجاعت کا شہرہ ہو گا۔ شہزادے کی شہرت وہاں بھی پہنچے گی جہاں انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ میرے زائچے بتاتے ہیں کہ شہزادہ اگر اپنی عمر کے سولہویں سال سے بحفاظت نکل گیا تو باقی زندگی آرام وسکون سے بسر کرے گا۔ اِس لیے میرا مشورہ ہے کہ عمر کے سولہویں سال میں شہزادے کو پل بھر کے لیے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں‘‘

بادشاہ سلامت کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک رنگ سا آیا مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور طشتری سے سونے چاندی کے سکوں کی کئی تھیلیاں اٹھا کر جوتشی کے سامنے ڈال دیں۔ جب جوتشی ساری تھیلیاں سمیٹ چکا تو بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ جوتشی کو ملکہ سے انعامات دلا کر رخصت کر دیا جائے۔

جوتشی کو فوراً ملکۂ عالیہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جوتشی نے جھک کر ملکہ کو آداب کہا۔ جوتشی اور ملکہ کے درمیان ایک باریک پردہ حائل تھا لیکن وہ اس پردے کے پار ملکۂ عالیہ کے چہرے پہ پھیلے خوشی کے رنگ اور آنکھوں کی چمک صاف دیکھ سکتا تھا۔

’’کہو کیا کہتے ہو میرے جگر کے ٹکڑے کے بارے میں۔‘‘ ملکہ نے پالنے میں پڑے میں شہزادے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جوتشی تو جیسے موقع کے انتظار میں تھا۔ اس نے ایک نظر ملکۂ عالیہ کو دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر کہا:

''ملکۂ عالیہ! مصر کے کھجوروں کے باغات نے ایسا چاند کبھی نہیں دیکھا۔ نیل کی لہروں کی قسم! میں نے لاکھوں زائچے بنائے ہیں لیکن ستاروں کی ایسی شاندار ترتیب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

ملکہ نے اپنی کنیز کو اشارا کیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے سکے بھر کے جوتشی کی پھیلی ہوئی جھولی میں ڈال دیے۔ جوتشی پھر گویا ہوا:

''ملکۂ عالیہ! شہزادے کا زائچہ بتاتا ہے کہ اس کے حسن و جمال اور شجاعت کا چرچا عام ہوگا۔ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی اپنا جھنڈا گاڑے گا اور نیل کے چاروں اور پھیلے میدانوں پر بھی اس کا راج ہوگا۔''

جوتشی نے باریک پردے کے اس طرف اس ماں کو دیکھا جسے خدا نے ایک عمر کے بعد اولاد عطا کی تھی۔ اسے اپنے بنائے ہوئے زائچے کے ساتویں اور بارھویں خانے کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ ساتواں خانہ جس کا تعلق شادی بیاہ اور اس سے متعلق دوسرے امور سے ہوتا ہے، ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ جوتشی کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا شہزادے کی شادی ہوگی بھی یا نہیں اور اگر ہوگی تو کس سے ہوگی۔ اس خانے میں بے یقینی کی ایسی دھند بھری ہوئی تھی کہ اسے کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بارھویں خانے میں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی لیکن یہاں کم از کم یہ عیاں تھا کہ شہزادے کے دشمن بہت طاقت ور ہوں گے لیکن اس کے دوست اور ہم درد ہر مشکل وقت میں اس کا ساتھ دیں گے۔ اس کے زائچے بتاتے تھے کہ شہزادے کو ایک لمبا، کٹھن اور جان لیوا سفر درپیش ہوگا لیکن وہ کچھ سوچ

کر چپ ہی رہا۔ اس نے ملکہ کو یہ نہ بتایا کہ اس کے حساب کے مطابق شہزادے کی قسمت میں دور دراز کا ایک مشکل سفر اور تنہائی کی کئی راتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اسے اس ماں کی قسمت پر رونا آ رہا تھا جس کے پہلو میں لیٹا ہوا بچہ، اپنے ماں باپ کی امیدوں کا مرکز، ایک دن ان سے جدا ہو جائے گا۔

شہزادہ سیف الملوک کی پرورش اور تربیت پر مامور کنیزیں ، غلام اور دوسرے کارندے دن رات محل میں حاضر رہتے۔ جب شہزادہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو ماہر اتالیق بھی مقررہ اوقات میں محل میں حاضری دینے لگے۔ شہزادے کی پرورش کے سارے انتظامات ایک وزیر کے سپرد تھے جو ہمہ وقت اس سارے عملے کی نگرانی کے لیے محل میں موجود رہتے تھے۔ گاہے گاہے بادشاہ سلامت جب شہزادے کو دیکھنے تشریف لاتے تو مستعد کارکنوں میں انعامات تقسیم فرماتے۔ جب شہزادہ سیف الملوک چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا اور چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنے لگا تو گُھڑ سوار، تیرانداز، تیراک اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین شہزادے کی تربیت کے لیے ملک کے دُور دراز علاقوں سے بطورِ خاص شاہی محل میں بلا لیے گئے۔ شہزادے کی تربیت پر مامور عملے کے افراد اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے اور وُہ شہزادے کی تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اِس کام کا اُن سب کو منہ مانگا معاوضہ ملتا تھا۔ اِس پہ مستزاد وُہ انعامات تھے جو بادشاہ سلامت کے دستِ خاص سے انہیں وقتاً فوقتاً عطا ہوتے رہتے تھے۔ ان میں کئی خوش نصیب ایسے بھی تھے جنہیں بادشاہ

سلامت نے اُن کی کارکردگی سے خوش ہوکر جاگیریں اور منصب عطا کیے تھے۔

غرض شہزادہ اِن مشاق ماہرینِ فن سے اکتسابِ فیض کرتا ہوا اب بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھنے والا تھا اور ابھی سے اُس کی لیاقت کا یہ عالم تھا کہ باید وشاید۔

بادشاہ سلامت شہزادہ سیف الملوک کو یوں پروان چڑھتا دیکھتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ ملکہ عالیہ تو شہزادے کو بس ایک نظر دیکھ کر صدقے میں کئی کئی اونٹ ذبح کرا دیتی تھیں۔ جس دن شہزادے نے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹھیک نشانے پر تیر پھینکا تھا، اُس دن کئی غلام آزاد کر دیے گئے تھے اور عمر قید کے کئی مجرموں کی بیڑیاں کھول دی گئی تھیں۔

شہزادہ سیف الملوک اسی ناز و نعم میں پل رہا تھا۔ اس کے ناز اور نخرے اٹھانے کے لیے غلاموں اور کنیزوں کی ایک فوج تھی جو دن رات اپنے کام پر مامور رہتی تھی۔ بادشاہ اور ملکہ تو اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے اور کیوں نہ چھڑکتے کہ ان کے باغ میں یہ پھول اس وقت کھلا تھا جب ان کی امیدوں کے دیے بجھنے ہی والے تھے۔

شہزادے کے دوست تعداد میں کچھ زیادہ نہیں تھے لیکن وہ سب اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ شہزادے کا مقام اور مرتبہ کیا ہے، اس لیے وہ کم سن ہونے کے باوجود بھی شہزادے کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے تھے۔

شہزادے کے یہ سارے دوست محل میں کسی روک ٹوک کے بغیر آتے اور اس

کے ساتھ بہت سا وقت گزار کے جب شہزادے کی طرف سے جانے کی اجازت ملتی تو گھر کو لوٹتے۔ اس رفاقت کے بدلے میں بادشاہ سلامت کی طرف سے ان کے والدین کو ہر وہ چیز عطا کی جاتی تھی جس کی وہ خواہش کرتے تھے۔ یوں شہزادہ بچپن ہی سے کئی ایک کے خوابوں کی تعبیر بن گیا تھا۔

باغ میں ان بچوں کے لیے ہر وہ چیز مہیا کر دی گئی تھی جو اس عمر کے بچوں کو بھاتی ہے۔ بادشاہ سلامت چاہتے تھے کہ بچے محل کے اندر اور اس کے سامنے پھیلے وسیع باغ میں شہزادے کے ساتھ خوش رہیں اور انھیں کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ ہو۔

شہزادہ سیف الملوک نے جس دن اپنی عمر کے گیارہویں سال میں قدم رکھا، اُس دن صبح کے وقت ملکہ عالیہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ایسا پھسلیں کہ دو دن تک انہیں مطلق ہوش نہ آیا۔ اُن کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ شاہی طبیب اپنے معاونین کے ساتھ مل کر ملکہ کو ہوش میں لانے کے جتن کر رہا تھا۔

شہزادہ اپنی ماں کو اِس حال میں دیکھ کر بہت افسردہ تھا۔ بادشاہ سلامت ایک طرف ملکہ کے لیے پریشان تھے اور دوسری طرف اُن سے شہزادے کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ دوپہر کے وقت وُہ شہزادے کو لے کر محل کے باہر اپنے وسیع و عریض باغ میں نکل آئے اور وزیرِ خاص سے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وُہ آج اپنے ہاتھوں سے غریبوں اور محتاجوں میں خیرات تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ وزیرِ خاص نے باغ میں بنے ہوئے چبوترے

پر بادشاہ اور شہزادے کے لیے نشستیں لگوا دیں اور شہر میں منادی کرا دی کہ آج بادشاہ سلامت اپنے ہاتھوں سے غربا و فقرا میں خیرات بانٹیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں باغ کے صدر دروازے سے حاجت مند گروہ در گروہ باغ میں داخل ہونے لگے۔ بادشاہ سلامت شام تک اِن میں خیرات بانٹتے رہے۔ شہزادہ سیف الملوک اپنی نشست پر بیٹھا یہ ساری کارروائی بڑے انہاک سے دیکھے جا رہا تھا۔

شام کو جب باغ میں شاہی عملے کے سوا کوئی بھی نہ رہا تو بادشاہ نے محل میں جانے کا قصد کیا۔ شہزادے نے جب باپ کا مدعا بھانپ لیا تو اُس نے بھی چپکے سے اپنی نشست چھوڑ دی۔ ابھی شہزادے نے چبوترے سے پاؤں نیچے نہیں رکھا تھا کہ باغ کے دروازے سے ایک درویش ننگے پاؤں، ننگے سر اندر داخل ہوا۔ درویش کے ایک ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ تھا اور دوسرا ہاتھ اُس نے چراغ پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے اُسے بجھنے سے بچا رہا ہو۔ شہزادہ درویش کو دیکھ کر بے اختیار اُس کی طرف بڑھا۔ درویش کے دریدہ ملبوس سے ایک ایسی خوشبو آ رہی تھی جو باغ میں کھلے ہوئے ہزار طرح کے پھولوں کی خوشبو میں بھی الگ سے سونگھی جا سکتی تھی۔

شہزادہ درویش کے بالکل قریب پہنچ کر رُک گیا اور بولا۔

''بابا ! مانگو کیا مانگتے ہو؟ آج تو جو کچھ مانگو گے، ملے گا''

درویش نے ایک نظر شہزادے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے پھونک مار کر چراغ کو بجھاتے ہوئے شہزادے سے کہا کہ ہم فقیر لوگ ہیں، ہمیں کسی سے کیا چاہیے، اور پھر اپنی ایڑی پر گھوم کر باغ سے باہر نکل گیا۔

شہزادے نے چاہا کہ آگے بڑھ کر درویش کو روک لے لیکن اُس کے پاؤں تو جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔شہزادہ وزیرِ خاص کی طرف مڑا اور اُسے حکم دیا کہ درویش بابا کو نہایت ادب اور احترام کے ساتھ واپس بلایا جائے۔وزیرِ خاص نے فوراً کارندے دوڑائے لیکن اُس درویش کو تو جیسے زمین نگل گئی تھی۔

دو دن بعد ملکہ کی آنکھیں بمشکل نیم وا ہوئیں۔شہزادہ سیف الملوک نے فرطِ محبت سے اپنی ماں کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ملکہ کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی سی دکھائی دی۔اُس نے شہزادے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا، کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن آواز کہیں حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔شہزادہ اپنی ماں پر جھکا، ملکہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن ملکہ کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

ملکہ کی موت کے بعد محل میں کئی دن تک سناٹا چھایا رہا۔ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اِس محل کے در و دیوار نے کبھی انسانی آواز سنی ہی نہیں۔شہزادہ سیف الملوک چند ہی روز میں کملا کر رہ گیا تھا۔بادشاہ نے جب شہزادے کو اِس قدر پریشان دیکھا تو ایک دن پیار سے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور پند و نصائح کا دفتر کھول دیا۔بہت دیر تک وُہ شہزادے کو زندگی کی بے ثباتی کے بارے میں بتاتے رہے۔یہ دفتر سمیٹنے کے بعد انھوں نے شہزادے کو بتایا کہ یہاں سے کئی کوس پر ایک پہاڑی سیر گاہ ہے۔وہاں زندگی کی تمام آسائشیں بہم پہنچا دی گئی ہیں۔شہزادے کو چاہیے کہ چند روز کے لیے اپنے مصاحبوں کے ہمراہ وہاں منتقل ہو

جائے۔شہزادہ خود بھی محل کے شب وروز سے اُکتا گیا تھا سو اُس نے فوراً ہامی بھر لی۔

بادشاہ سلامت نے فوراً وزیر خاص کو حکم دیا کہ شہزادے کے دوستوں کو محل میں بلا لیا جائے۔

یہ ایک خوبصورت پہاڑی مقام تھا۔ٹھنڈے پانی کے چشمے،آبشار، بل کھاتی پگڈنڈیاں،خود رو پھول ، نیچے دُور وادی میں اپنی ہی دُھن میں بہتا دریا، گھنے سایہ دار اشجار،خوش گلو طائروں کے چہچہے،سرسبز زینہ دار کھیت غرض چاروں اور فطرت اپنے پورے حسن کے ساتھ شہزادے کے سواگت کے لیے موجود تھی۔

پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹے سے میدان میں شاہی مہمان خانے کی عمارت تھی جہاں گرمیوں میں بادشاہ کے مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔شہزادے کو اپنے کمرے کے دریچے سے دُور پہاڑ پر ہلکی ہلکی برف دکھائی دے رہی تھی ۔اس نے کبھی برف نہیں دیکھی تھی لیکن برف کے بارے میں سنا ضرور تھا ۔اس نے اس پہاڑ پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔شہزادے نے فطرت کو اتنے قریب سے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا ،سو جس طرف اُس کی نگاہ اُٹھتی وُہ پہروں اُدھر ہی دیکھتا رہتا۔

ایک دن جب ساری وادی دُھند میں لپٹی ہوئی تھی ،شہزادہ کسی کو بتائے بغیر چپکے سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وادی کی سیر کو نکل گیا۔شہزادے کا گھوڑا ایک کشادہ پگڈنڈی پر آہستگی سے نیچے اُس سمت کو رواں تھا جہاں جھاگ اُڑاتا دریا چٹانوں سے سر ٹکراتا نشیب کو

بہہ رہا تھا۔ دُھند اتنی تھی کہ دریا بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی شہزادے کا گھوڑا دریا پر بنے ہوئے لکڑی کے پُل کے قریب پہنچا ہی تھا کہ عقب سے ایک گھوڑا شہزادے کے گھوڑے کے قریب آیا۔ گھوڑے پر ایک دوشیزہ سوار تھی۔ شبنمی بوسوں میں دُھلی گلاب سی تازہ اور اپسراؤں جیسے رنگ وروپ کی مالک یہ حسینہ سیاہ لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھی۔ اُس نے شہزادے کی طرف ہاتھ لہرایا اور پھر یہ جاؤہ جا ہوگئی۔

شہزادے پر ایک لمحے کے لیے گویا سکتہ سا طاری ہوگیا۔ اِس قدر بھرپور حسن اور اس پہ یہ ادائیں شہزادے کے مشاہدے میں پہلی بار آئی تھیں۔ شہزادے نے گھوڑے کو فوراً ایڑ لگائی گھوڑا لکڑی کے ہچکولے کھاتے پُل پر سے آندھی کی طرح گزرا اور پھر وادی میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ دُور دُھند کے اُس پار اُسے اُس دوشیزہ کا گرد اُڑاتا گھوڑا ایک نقطے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں گھوڑے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ممکن ہے اس دوشیزہ کو اپنی منزل کا پتا ہو لیکن شہزادے کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دوشیزہ اسے اپنے پیچھے کہاں لیے جا رہی ہے۔ وہ تو بس گھوڑے کو دوڑائے جا رہا تھا، کسی انجان سمت میں ایک انجان حسینہ کے تعاقب میں۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اس حسینہ کے گھوڑے تک پہنچنے میں ناکام رہا، فاصلہ تھا کہ کسی صورت کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کئی کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد شہزادے کو پہاڑ کے دامن میں ایک کٹیا کے آگے اس دوشیزہ کا گھوڑا نظر آیا۔ سفید دودھیا گھوڑا جس نے اس کے شاہی گھوڑے کو مات دی تھی اور اس پر سوار وہ دوشیزہ جس کے قیامت خیز حسن اور اداؤں نے اس کا دل گھائل کر دیا تھا۔

وُہ اپنے گھوڑے کو دائرے میں گھماتے ہوئے اردگرد متلاشی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر وُہ گھوڑے سے کود کر بے در کی کٹیا میں داخل ہوگیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے حیرت سے اُس

کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اُس کے سامنے فرش پر بچھے ایک پرانے ٹاٹ پر وُہی مردِ درویش بیٹھا ہوا تھا جو اُس کی والدہ کے انتقال سے دو روز پہلے ہاتھوں میں جلتا ہوا چراغ لیے شاہی محل میں آیا تھا۔شہزادے کو چند ثانیے حیرت کے بھنور میں غوطے کھاتے گزر گئے۔اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ممکن تھا کہ اُسے اِس حصار سے باہر آنے میں بہت سا وقت اور بھی لگ جاتا کہ اُسے جیسے دُور کہیں سے آتی ہوئی درویش کی آواز سنائی دی۔

''آ جاؤ! یہاں میرے پاس آ جاؤ''

شہزادہ آگے بڑھا اور مجذوب کے پاس ٹاٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔جس دوشیزہ کے تعاقب میں وُہ یہاں پہنچا تھا اب وُہ اُسے یاد بھی نہیں تھی۔اب تو بس اُسے اتنا یاد تھا کہ اس درویش کی اُسے ایک مدت سے تلاش تھی لیکن اب اُس میں تابِ گویائی نہیں تھی کہ وُہ درویش سے کوئی سوال کرتا۔شہزادہ پھٹے پُرانے ٹاٹ پر درویش کے قریب یوں بیٹھا تھا جیسے وُہ کسی ہفت اقلیم کے حکمران کے حضور کوئی عرض گزارنے حاضر ہوا ہو۔

''کہو! اِس فقیر کی کٹیا میں کیسے آنا ہوا؟''

اُس مردِ درویش کا سوال سن کر شہزادہ جیسے سوتے سے جاگ اُٹھا۔اُس نے بے اختیار اِدھر اُدھر دیکھا مگر اس چھوٹی سی کٹیا میں اُن دونوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہیں تھا۔اُس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن اُس کی زبان تو جیسے تالو سے چپکی ہوئی تھی۔اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے منہ میں ریت بھری ہوئی ہے۔

''پانی۔۔۔!''

شہزادے کے منہ سے بمشکل یہ لفظ ادا ہوا۔اُس درویش نے پاس پڑا ہوا مٹی کا پیالہ

اٹھا کر شہزادے کے قریب رکھ دیا۔شہزادے نے پانی سے بھرے پیالے کو ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ شہزادے کی ساری توانائیاں پھر سے عود کر آئیں۔اب اُسے ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔اُس نے نظر اُٹھا کر درویش بابا کے چہرے کی طرف دیکھا۔سمندر جیسے پُرسکون درویش بابا کے چہرے کی دراڑوں میں نور کے دھنک رنگ دریا موجزن تھے۔

''بابا! آپ شاہی باغ سے یوں اچانک کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے آپ کو بہتیرا تلاش کرایا مگر مایوسی کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔میں نے۔۔۔۔۔۔''

شہزادہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر درویش بابا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے مزید کچھ کہنے سے منع کر دیا۔

''دیکھو ! ایسے سوال نہیں پوچھا کرتے جن کا کوئی جواب نہ ہو۔''

اتنا کہہ کر درویش بابا خاموش ہو گئے۔درویشِ کم سخن کے اِس اندازِ سخن سے ایک بار تَو شہزادہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ناز و نعم میں پلے ہوئے شہزادے کے لیے درویش کی یہ بے نیازی سمِ قاتل سے کسی طور کم نہیں تھی۔سووُہ یکبارگی اُٹھا اور کٹیا سے باہر نکل گیا۔دُھند، تاریکی اور رگ و پے میں سرایت کرتی سردی میں شہزادے کو دو قدم چلنا محال ہو رہا تھا۔اِس پہ مستزاد کہ شہزادے کا گھوڑا بھی اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر شہزادہ سیف الملوک انجانے اندیشوں میں گھرا اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا کہ اچانک اُسے کہیں دُور سے آتی ہوئی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔آواز کی سمت کا تعین کرنے میں اُسے چنداں دُشواری نہیں ہوئی۔وُہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر تیرگی اور دُھند میں

اندازے سے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ قدم قدم پہ ٹھوکریں کھاتا، گرتا پڑتا وُہ لحظہ بہ لحظہ آواز کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

اب اُسے آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوئی لڑکی رات کے اِس سمے، اِس سرد موسم میں نہایت سوز سے ایک درد بھرا گیت گا رہی تھی۔ شہزادے کو لڑکی کی آواز کی صورت میں رات کے اُس کنارے پر ایک جلتے بجھتے جگنو جیسی امید دکھائی دی۔ اُس کی رفتار میں از خود اضافہ ہونے لگا۔ وُہ جلد سے جلد اس مجسم غنا لڑکی کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اچانک اُسے محض چند گز کے فاصلے پر ایک روشنی سی دکھائی دی۔ شہزادہ بے چینی سے آگے بڑھا۔ اب وُہ پتھر پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ لڑکی اپنے اردگرد سے بے نیاز، اپنی ہی دُھن میں گائے جا رہی تھی۔

یہ رات
تمہاری ایڑیوں سے پھوٹتی
کرنوں کی خوشبو سے معطر ہے
نشیب میں بہتا ہوا دریا
اُس شہر کے پہلو سے ہو کر گزرے گا
جہاں کی رات
مرے دن سے بڑھ کے روشن ہے
مرے اشکوں کے سوتے
اگر بانجھ نہ ہوتے
تو میں کوئی چراغ سا آنسو

کسی موج کی ہتھیلی پر رکھتی

تمہارے زانوؤں پر سر رکھ کر

مرنے کی آرزو

مرے ساتھ ہی راکھ ہو جائے گی

یہ رات

میری لحد ہے

اور یہ دُھند میرا کفن۔

لڑکی کی آواز غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرح ڈوبنے لگی۔شہزادے کی آنکھوں میں جھلمل جھلمل کرتے ستارے رقص کرنے لگے۔وُہ بے اختیار آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ لڑکی کے شانے پر رکھ دیا۔لڑکی نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور ایک اجنبی کو اپنے قریب پا کر حیران رہ گئی۔وُہ لڑکی تھی یا آسمان سے اُتری ہوئی اپسرا۔روح کو گھائل کر دینے والا ایسا حسن شہزادے نے اِس سے پہلے کہیں دیکھا تھا نہ سنا تھا۔

وہ لڑکی تھی کہ جنت کی پری۔گال پر سیاہ تِل جو اندھیرے میں بھی صاف دکھائی دے رہا تھا،آنکھوں میں کاجل جس نے آنکھوں کو اور بھی گہرا کر دیا تھا،مانگ میں ستارے جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی،ماتھے پر بنی ہوئی بیل جس میں نو شگفتہ کلیوں کی بہتات تھی،جوڑے میں گجرا جس کی خوشبو سے فضا معطر ہو رہی تھی،کانوں میں کرن پھول جو رہ رہ کر اس کی گردن کے بوسے لے رہے تھے،گلے میں مالا جس کے موتی اپنے رنگوں کی بہار دکھا رہے تھے،بالوں میں ایسے موتی جو شہزادے نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے،ہونٹوں پر تازہ کھلے ہوئے گلاب کی سرخی،دانت ایسے کہ ان پر ہیروں کا گماں ہوتا تھا،

سینے پر انگیا جو بہار کا جوبن سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی، پوروں میں ایسے چھلے جیسے اس نے قوسِ قزح پہن رکھی ہو، شفاف کلائیوں میں ایسی چوڑیاں جو آپس میں ٹکراتیں تو جیسے بن میں بانسری بجنے لگتی، ہتھیلیوں پر منہدی جس کے رنگ ساری فضا میں گھلے ہوئے تھے، کمر میں گاتی جو شانوں پر سے ہوتی ہوئی اس گرہ پر آ کر ختم ہوتی تھی جس کے پس منظر میں چشمہ ٔحیات لہریں لے رہا تھا اور پاؤں میں جھانجھر جسے چھونے کے لیے دریا کا پانی اپنی بساط سے بڑھ کر بے تاب ہو رہا تھا۔

شہزادہ اس قیامت کے حسن میں کھویا ہوا تھا، اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ معاً اسے خیال آیا کہ وہ تو اس لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے رنگ و نور کے اس چشمے تک آ پہنچا ہے۔

''میں شہزادہ سیف الملوک ہوں۔ بھٹک کر جانے کہاں نکل جاتا
کہ تمہاری آواز کی روشنی اور لہجے کی خوشبو نے مجھے سنبھال لیا۔''

ورطۂ حیرت میں ڈوبا ہوا شہزادہ گویا ہوا۔ لمحہ بھر دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں طرف ایک چنگاری سی سلگی اور پھر الاؤ بھڑکنے لگا۔ لڑکی کی حیرت اس کے وجود سے ہوتی ہوئی شہزادے کے اندر تک اتر آئی۔ وہ شہزادے کو دیکھے جا رہی تھی، چپ چاپ۔ بھڑکتے ہوئے الاؤ کا سیک شہزادے کو روح تک پگھلا رہا تھا لیکن وہ لڑکی تھی کہ کوئی بات ہی نہیں کر رہی تھی۔ شاید اسے بھی اس الاؤ کی حدت بھا گئی تھی اور وہ دیر تک اسی کیفیت میں رہنا چاہتی تھی۔

ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا، دریا کی لہروں پر سے ہوتا ہوا دونوں سے ٹکرایا۔ لڑکی نے اپنی گاتی کی گرہ پر اپنی انگلی یوں پھیری جیسے یہ اندازہ کرنا چاہتی ہو کہ کہیں ہوا کے کسی چنچل

جھونکے سے گرہ کھل تو نہیں گئی۔ جب اسے اس طرف سے اطمینان ہوا تو اس نے پہلے اپنے پاؤں سمیٹے، پاؤں جن پہ پانی کے قطرے جل بجھ رہے تھے، یوں جیسے ستارے اس کے پاؤں پر اتر آئے ہوں۔

''خدا کے لیے کچھ تو بولو۔ تمھاری یہ خاموشی اب تو میری رگوں میں دوڑنے لگی ہے۔''

شہزادے کے لہجے میں التجا کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ لڑکی کبھی کبھی دزدیدہ نگاہوں سے شہزادے کی طرف دیکھتی تھی اور پھر نگاہیں اپنے پاؤں کے پنجوں پر مرکوز کر لیتی تھی۔ شہزادے کو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا تو چاہتی ہے لیکن شاید اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

آخرِ کار اس لڑکی نے بہت دھیمے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر نگاہیں جھکا لیں۔

''میں نے بتایا تو ہے کہ میں شہزادہ سیف الملوک ہوں، تُم بھی اپنے بارے میں کچھ بتاؤ نا؟''

شہزادہ سراپا التجا تھا۔

''میرا نام بدیع الجمال ہے۔ میں دُور دیس کی باسی ہوں۔ اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے یہاں آئی ہوں۔''

اُس سیمیں بدن کی آواز میں جھرنوں کا ترنم تھا۔ شہزادے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا:

''میں نے زندگی میں کوئی خواب نہیں دیکھا لیکن مجھے خواب

دیکھنے سے پہلے ہی تمہاری صورت میں اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔تم نے ایسا کون سا خواب دیکھا ہے جس کے تعبیر کی خواہش تمھیں یہاں لے آئی ہے۔''

وہ چپ تھی اور شہزادہ اس انتظار میں تھا کہ وہ کچھ بتائے تو پتا چلے کہ خواب انسان کے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلتے ہیں۔

''میں نے زندگی کا خواب دیکھا تھا اسی کی تعبیر کی خواہش مجھے ان ویران جنگلوں اور گھاٹیوں میں لیے پھرتی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں ایسی اداسی بھرنے لگی تھی کہ شہزادہ بھی اداس ہو گیا۔

''مجھے تو آج میری زندگی مل گئی ہے۔''

بدیع الجمال نے اُس کی طرف دیکھا۔اُس کی آنکھوں میں کوئی انجانا دُکھ تھا۔لفظ اُس کے ہونٹوں پر پگھلتی ہوئی برف کی طرح پھسل رہے تھے۔

''لیکن مجھے اپنانے کے لیے تمہیں موت سے پنجہ آزمائی کرنا ہو گی۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا سینہ چیرنا ہوگا اور انتظار کی سولی پر مصلوب ہونا ہوگا۔''

''میں یہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' شہزادے نے پورے عزم سے جواب دیا۔

'' تَو پھر جا کر اُس درویش کے پاؤں پکڑ لو۔اُس کی مدد کے بغیر تمہارے لیے یہ سب کچھ کرنا ممکن نہیں۔''

پھر اُس دوشیزہ نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ شہزادے کے ہاتھ میں دے

دیا۔شہزادے نے آہستگی سے اُس رشکِ ماہ کے ہاتھ کی پُشت پر ایک نرم بوسہ دیا۔بوسے کی حدت سے بدیع الجمال کا بدن جیسے پگھل سا گیا۔دونوں کے ماتھے پر پسینے کی مشعلیں فروزاں ہوئیں۔

''میرا مشورہ ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔میں تمھیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔میری بات مان لو،اب بھی وقت ہے جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔''

اب لڑکی کے لہجے میں التجا کے ساتھ گہری اداسی کے ان گنت رنگ نمایاں تھے۔شہزادے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا:

''یہ ممکن نہیں،مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

''یہ بات ہے تو سنو اے اجنبی نوجوان!بدیع الجمال اب تمھاری ہے،صرف تمھاری۔''

یہ کہہ کر وُہ پری رو شہزادے کے اور بھی قریب سرک آئی اور اُس کے گالوں پر بوسہ دے کر گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔اُس دوشیزہ کے بدن سے اجنبی مہک کا چشمہ پُھوٹ پڑا اور پھر شہزادے کی آنکھوں میں اندھیرا ناچنے لگا۔

شہزادہ سیف الملوک کو جب ہوش آیا تو وُہ اُسی درویش کی کٹیا میں پھٹے پُرانے ٹاٹ پر لیٹا ہوا تھا۔درویش اُس کی طرف پیٹھ کیے آلتی پالتی مارے بیٹھا زیرِلب کچھ پڑھ رہا

تھا۔شہزادے نے اُٹھنا چاہا لیکن اُس کا انگ انگ بُری طرح دُکھ رہا تھا اور اُس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وُہ اپنی جگہ سے ہِل سکتا۔اُسے رہ رہ کر وُہ پری چہرہ یاد آ رہی تھی۔جانے وہ کہاں گئی؟ میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟

اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم لے رہے تھے۔وہ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

''کہیں وُہ سب کچھ خواب تو نہیں تھا؟''

شہزادے کا ہاتھ بے اختیار اپنے گالوں کی طرف اُٹھا جیسے وُہ اپنے رُخسار پر ثبت اُس حسینہ کے بوسے کو اب بھی چھو سکتا ہو۔اُسے اپنے بدن سے اب بھی وُہ اجنبی مہک آ رہی تھی جس کا سر چشمہ اُس دوشیزہ کے بدن میں کہیں تھا۔

''لیٹے رہو! تُم رات بھر باہر سردی میں بے ہوش پڑے
رہے ہو۔آخر تُم چاہتے کیا ہو؟''

درویش کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔شہزادہ سہم گیا۔

''بابا ! میرے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے ورنہ میں مر جاؤں گا'' شہزادہ سراپا عجز و انکسار تھا۔

''جس راستے پر تُم چل نکلے ہو اُس کی کوئی منزل نہیں ہے۔بہتر
ہے کہ ابھی سے اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ ورنہ بعد میں واپسی کے
سارے راستے مسدود ہو جائیں گے۔''

''بابا ! اب لوٹ جانا میرے اختیار میں نہیں۔مجھے آپ کی مدد اور شفقت چاہیے۔''
شہزادہ اتنا کہہ کر بہت مشکل سے اُٹھا اور درویش کے پاؤں پکڑ کر بولا۔

''بابا ! اِس بھری کائنات میں آپ کے سوا کوئی میرے دُکھ کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگر آپ نے مجھے سنبھالا نہ دیا تو میں خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ جاؤں گا۔''

درویش نے محبت سے اپنا ہاتھ شہزادے کے سر پر رکھا اور اُس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''لیکن تُم ناموجود کے گرداب میں موجود کی جستجو کر رہے ہو۔ اِس گرداب میں موت نے اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ مجھے تُم سے ہمدردی ہے۔ میری بات مان لو، جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔''

''میرے مقدر میں یہی لکھا ہے تو مجھے معذور جانیے۔'' شہزادے کے لہجے میں دُکھ درد کے سائے سانس لینے لگے۔ درویش نے سر سے لے کر پاؤں تک اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک صحرا حائل تھا جسے کم از کم شہزادہ کبھی عبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں تو بولنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زبان میں کیلیں ٹھونک دی گئی ہیں۔ اسی عالمِ بے چارگی میں جانے کس لمحے اس نے درویش کے پاؤں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس طرف دیکھنے لگا جدھر کچھ بھی نہیں تھا۔

درویش نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، ایک گہرا سانس لیا اور کہا:

''میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور یہاں آؤ گے۔''

''مگر کیسے بابا؟ آپ کیسے جانتے تھے کہ میں یہاں آؤں گا''

درویش نے ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر یوں گویا ہوا:

''یہ بہت پہلے کی بات ہے۔میں ان دنوں دریائے نیل کے کنارے ایک پرانے کھنڈر میں عبادت کیا کرتا تھا۔عیسیٰؑ سے کوئی ہزار،ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہاں ایک عبادت گاہ ہوا کرتی تھی۔مرشد کے حکم پر میں نے اس کھنڈر میں بارہ سال دن رات عبادت کی۔پھر مجھے مرشد نے خواب میں پہاڑوں کی طرف نکل جانے کا حکم دیا۔میں نے اپنا چراغ لیا اور اس کھنڈر سے نکلا۔جب میں شہر میں داخل ہوا تو تمھارے باپ عاصم بن صفوان کے محل کی طرف جانے کا حکم ملا۔میں محل کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ تم اور تمھارا باپ فقیروں میں خیرات بانٹ کر محل کے اندر جانے کے لیے چبوترے سے اتر رہے تھے۔''

درویش نے اس کی طرف دیکھا،کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن کہا کچھ نہیں۔شہزادے نے کہا:

''پھر کیا ہوا بابا؟ آپ وہاں سے اچانک ہی غائب ہو گئے۔''

''کچھ نہیں،جیسے مرشد کا حکم۔''

''بابا! آپ کے مرشد کون ہیں۔اب تو انھیں دیکھنے کی تمنا میرے دل میں بیدار ہو گئی ہے۔''

درویش نے محبت بھری نظروں سے شہزادے کی طرف دیکھا مگر اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔شہزادے کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک بار پھر ان سے ان کے مرشد کے بارے میں پوچھے لیکن اسے اس کی ہمت نہ ہوئی۔

''میں تمھاری مدد ضرور کروں گا کہ اس میں بھی ایک رمز ہے لیکن تم وعدہ کرو کہ تم مجھ سے اس رمز کے بارے میں کبھی نہیں پوچھو گے۔''

''ٹھیک ہے بابا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ سے اس بارے میں کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔''

شہزادے نے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

درویش کچھ کہے بِنا اپنی جگہ سے اُٹھا اور ایک پوٹلی سے چاندی کی انگوٹھی نکال لایا۔

''لو ! اِسے اپنے پاس رکھو، تمہارے کام آئے گی۔ لیکن یاد رکھو ! اِس راز سے کوئی تیسرا آگاہ نہ ہونے پائے''

شہزادے نے انگوٹھی اپنی اُنگلی میں پہنتے ہوئے درویش کی طرف تشکر بھرے انداز میں دیکھا۔

''اب تُم جا سکتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اپنے من کی مراد پانے کے لیے ابھی تمہیں بہت انتظار کرنا ہے۔''

اتنا کہہ کر درویش پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور شہزادہ اُلٹے قدموں کٹیا سے باہر نکل آیا۔ وہ باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا گھوڑا کٹیا کے باہر نرم نرم گھاس کے مزے اُڑا رہا ہے۔

☆

شہزادہ جب مہمان خانے پہنچا تو اُسے ایک اور غیر معمولی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے مصاحبوں، غلاموں اور مہمان خانے کے منتظمین، کسی نے بھی اُس کی رات بھر کی غیر حاضری کے بارے میں اُس سے استفسار نہ کیا۔ گویا وُہ محض چند لمحوں ہی کے لیے باہر گیا تھا حالانکہ وُہ درویش کی کٹیا سے لے کر مہمان خانے تک کے سارے سفر میں یہی سوچتا رہا تھا کہ اُس کی غیر حاضری کی وجہ سے اُس کے اِن سارے متعلقین میں کھلبلی مچی ہوئی ہوگی مگر یہاں تو معاملہ ہی جدا تھا۔ کسی کو خبر ہی نہیں تھی کہ شہزادے نے ساری رات باہر گزاری ہے۔ اِس صورتِ حال سے شہزادے کو کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہُوا کہ وُہ بے جا بحث و تکرار میں اُلجھنے سے بچ گیا۔

اب تو شہزادے کو یہ گمان پڑتا تھا کہ وُہ ضرور کسی طلسماتی چکر میں پھنس گیا ہے۔ پے در پے غیر معمولی واقعات نے اُس کے دل میں شک کا کانٹا تیر کی طرح ترازو کر دیا تھا۔ وُہ ذرا سی دیر اپنے دوستوں کے پاس بیٹھا لیکن اُس کا اُن میں جی نہ لگا اور وُہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک بے چینی تھی جو اُس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ وُہ کچھ کر گزرنا چاہتا تھا مگر اُس کی سوچیں ریشم کی طرح اُلجھ گئی تھیں اور کوئی سرا اُس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

اُس نے اپنے کمرے کا دریچہ کھولا اور دُور پہاڑوں پر جمی ہوئی برف پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اُس کی نظروں میں اُسی دوشیزۂ سرو قامت کے خدوخال اُبھر رہے تھے۔ اُس کی جھرنوں جیسی آواز شہزادے کی روح کی گہرائیوں میں جلترنگ بجا رہی تھی۔ گاہے گاہے

درویش کا دراڑوں بھرا چہرہ بھی اُس کے سامنے آ جاتا۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وُہ چونکا۔اُس کا مصاحبِ خاص صاعد بن صالح حاضر ہونے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

''آ جاؤ !'' اُس کی آواز بھی درویش کے چہرے کی طرح دراڑوں سے بھر گئی تھی۔دروازہ کھول کر اُس کا مصاحب دست بستہ اُس کے حضور آن کھڑا ہُوا۔

''کہو ! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بادشاہ سلامت نے آپ کو واپس آنے کا سندیسہ بھیجا ہے''

شہزادے کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے سر پر ہتھوڑے سے وار کر دیا ہے۔وُہ اِن فضاؤں اور ہواؤں سے اِس قدر مانوس ہو چکا تھا کہ واپسی کا خیال ہی اُس کے لیے سوہانِ روح تھا لیکن وُہ اپنے مہربان باپ کو بہر طور ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا،سو نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اقرار میں سر ہلا دیا اور پھر دھڑام سے پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

شہزادہ سیف الملوک اب سولہ سال کا ہو گیا تھا۔ایسا جوانِ رعنا کہ جس کا حسن مثالی تھا اس خطے میں تو کیا کہیں اور بھی شاید ہی پیدا ہوا ہو۔اس کے قامت پہ کھجور کے پیڑ رشک کرتے تھے۔اس کے ملیح چہرے پہ نور کی ایسی پھوار پڑتی تھی کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔شبنمی آنکھیں،گال جیسے صبح کی تازہ اوس میں بھیگے ہوئے پھول،ہونٹ رشکِ گلاب، کشادہ ماتھے پہ لہلہاتے بال جن کی رسائی کان کی لوؤں تک تھی،گردن ایسی کہ جیسے ستارے

جھک جھک کے دیکھتے تھے، ہاتھوں میں ایسی نرمی جیسے کوئی پہاڑی چشمہ جس کے چاروں اطراف خودرو پھول کھلے ہوں، اٹھتے ہوئے قد پہ قیامت کی چال جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہیں دلوں پر پڑتے ہوں۔ وہ شہر میں نکلتا تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سارا شہر امڈ آتا تھا۔

شہزادہ سیف الملوک حسن ہی میں یکتا نہیں تھا بلکہ عقل وفہم میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ طبیعت میں ایسی حلیمی تھی کہ جس سے بات کرتا تھا اس کے دل میں گھر لیتا تھا۔ ایک زمانہ اس کی محبت کا دم بھرتا تھا لیکن سبھی کو اپنے عشق کی آگ دھیمی رکھنا پڑتی تھی۔ کون سا ایسا گھر تھا جس میں شہزادے کا تذکرہ نہ ہوتا ہو۔

بس ایک بات تھی کہ شہزادہ ہر کام عجلت میں کرتا تھا جیسے کرنے کے لیے بہت سے کام ہوں۔ بادشاہ سلامت اس کی اس عادت سے بعض اوقات پریشان بھی ہو جاتے تھے، کیوں کہ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک اندیشہ بیٹھا ہوا تھا۔ انھیں اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں ایک بار انھوں نے کسی کام میں عجلت کا مظاہرہ کیا تو ان کی ماں نے انھیں سمجھایا تھا کہ بیٹا اتنی عجلت اچھی نہیں ہوتی۔

چونکہ شہزادہ اب سولہ سال کا ہو گیا تھا لہٰذا بادشاہ کے ذہن میں جوتشی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ بادشاہ کو اب یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں شہزادہ، بادشاہ اور دیگر افراد کی غیر معمولی توجہ کے پسِ پردہ محرک سے آگاہ نہ ہو جائے، سو ہر طرح کی احتیاط برتی جا رہی تھی۔ بادشاہ سلامت جوتشی کے مشورے کے مطابق شہزادے کو ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے جتن کرتے۔ کاروبارِ مملکت میں اُن کی دلچسپی ایک دم سے کم ہو گئی تھی۔ ایسے میں وزیرِ خاص کے صائب مشوروں اور توجہ نے اُن کی بہت ڈھارس

بندھائی۔ بادشاہ کو دن بھر بُرے بُرے خیالات اور رات کو ڈراؤنے خواب اب تواتر سے آنے لگے تھے۔لگتا تھا جیسے چند ہی دنوں میں انہوں نے اپنی عمر کے کئی سال گزار دیے ہیں۔

ایک صبح شاہی باغ کی رکھوالی پر مامور کارندوں کے نگران نے اطلاع دی کہ باغ کا وُہ حصہ جہاں بادشاہ سلامت اکثر سیر کی غرض سے تشریف لے جاتے ہیں، رات کو کسی نے بُری طرح اُکھیڑ کے رکھ دیا ہے۔ بادشاہ سلامت وزیرِ خاص کی معیت میں باغ کا جائزہ لینے کے لیے خود باغ میں تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ تناور پیڑ جڑ سے اُکھڑے پڑے ہیں، روشیں کھدی ہوئی ہیں، پھولوں کی کیاریوں پر جیسے ہل چلا دیا گیا ہے، شاہی باغ کی فصیل کا ایک حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہُوا ہے، غرض باغ کا نقشہ ہی بدلا ہُوا ہے۔ باغ کے نگران نے بتایا کہ باغ کی حفاظت پر مامور عملہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ وزیرِ خاص بھی دم بخود تھے کہ آخر یہ کس کی کارستانی ہوسکتی ہے۔ رعایا تَو بادشاہ کے عدل، سخاوت اور رحم دلی کا دم بھرتی ہے۔ آس پاس کی سلطنتوں سے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ پھر آخر کس نے راتوں رات باغ کا یہ حال کیا؟

بادشاہ سلامت کے من میں اور ہی طرح کے اوہام جنم لے رہے تھے۔ باہمی مشورے سے آخر کار یہی طے پایا کہ باغ کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کا اور ایک دستہ بطورِ خاص متعین کر دیا جائے۔

مگر اِن سارے حفاظتی اقدامات کے باوجود دوسری صبح باغ کے ایک اور حصے کی تباہی کی خبر بادشاہ کو اُس وقت ملی جب وُہ ابھی پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوئے تھے۔ وُہ جبہ زیبِ تن کر کے جونہی حجلۂ خاص سے باہر آئے، شہزادہ سیف الملوک کو اپنے سامنے کھڑا

پایا۔

’’بابا ! آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟‘‘ شہزادے نے سوال کیا۔

’’معلوم نہیں بیٹا۔‘‘ وُہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ شہزادہ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ راہداری میں وزیرِ خاص بھی موجود تھے۔ بادشاہ نے اُنہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں بعد اُکھڑا ہُوا باغ اور ٹوٹی ہوئی فصیل اُن کے سامنے تھی۔ بادشاہ نے ایک نظر اُکھڑے ہُوئے باغ پر ڈالی اور پھر پلٹ کر شہزادہ سیف الملوک کی طرف دیکھا۔ کسی انجانے خوف کے سائے بادشاہ سلامت کے چہرے پر صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ اُن کے چہرے پر جیسے کسی نے مٹھی بھر ہلدی چھڑک دی تھی۔ وُہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے شاہی محل کی طرف واپس مڑے۔ وزیرِ خاص اور شہزادہ بھی خاموشی سے اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ شاہی محل کے صدر دروازے پر پہنچ کر وُہ ذرا سی دیر کے لیے رکے، وزیرِ خاص کی طرف نگاہ خاص سے دیکھا اور شہزادے سے مخاطب ہو کر گویا ہوئے۔

’’تمھیں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں باغ کی حفاظت کے لیے مزید اقدامات کر رہا ہوں۔ شرپسند دشمن جلد ہی ہماری گرفت میں ہوگا۔‘‘

لیکن اِن مزید اقدامات سے بھی لاحاصلی ہی ہاتھ آئی۔ باغ کی نگرانی پر مامور عملہ اور سپاہی کسی طور یہ نہ جان سکے کہ ہر رات باغ کا ایک حصہ فصیل سمیت کیسے اور کس کے ہاتھوں سنگ و خشت کا ڈھیر بن جاتا ہے؟

☆

اُس رات جب بادشاہ سلامت آرام کی غرض سے اپنے حجلۂ خاص میں تشریف لے گئے ، غلام گردشوں میں جلتی مشعلیں بُجھ گئیں ، غلام اور کنیزیں محوِ خواب ہو گئیں، شہزادہ دبے پاؤں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ستونوں کی اوٹ میں ہوتا ہُوا محل کے بغلی دروازے سے نکل کر باغ میں بنے چبوترے کے ساتھ ایک جھاڑی کے پیچھے جا بیٹھا۔ باغ میں ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ باغ کی حفاظت پر مامور عملے کے کارکن اور سپاہی ہاتھوں میں مشعلیں اُٹھائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ شاہی محل پر سکوت طاری تھا لیکن باغ میں دن کا سا سماں تھا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی اور شہزادہ جھاڑی کے پیچھے چھپا بیٹھا سینکڑوں افراد کو باغ میں گھومتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

اچانک شہزادے کو اپنے قریب گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اُسے کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ چند لمحوں بعد باغ میں بگل کی آواز گونجی۔ یہ آواز سنتے ہی باغ میں پھیلے ہوئے افراد اپنی اپنی جگہ بُت بن کر کھڑے ہو گئے۔ سب کے ہاتھوں میں مشعلیں جل رہی تھیں مگر کوئی اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا تھا، جیسے سب پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ شہزادہ دوڑتا ہُوا جھاڑی کے پیچھے سے نکلا۔ اُس نے دھکے دے دے کر سپاہیوں کو اس سکتے سے باہر لانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وُہ سب تو جیسے پتھر کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔ اب شہزادہ اُن مجسموں کے درمیان اکیلا کھڑا صورتِ حال پر غور کر رہا تھا کہ اچانک باغ کی فصیل کا ایک حصہ دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔ شجر اُکھڑ اُکھڑ کر نیچے گرنے لگے اور پھولوں سے بھری کیاریاں خود بخود اُلٹ پلٹ ہونے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے باغ کا ایک

حصہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

شہزادے نے دیکھا کہ جہاں سے باغ کی فصیل گری تھی، وہاں سے ایک گھڑسوار باغ میں داخل ہُوا۔شہزادہ گھوڑے کی طرف بھاگا مگر اچانک سارا باغ دھوئیں سے بھر گیا۔شہزادے کو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔

جب وہ گھوڑے کے قریب پہنچا تو ایک گرے ہوئے درخت کے تنے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔وہ اٹھنے کی کوشش میں ایک بار پھر تنے سے ٹکرایا تو اسے قہقہے کی آواز سنائی دی۔اس نے غور سے دیکھا تو اسے ایک چھوٹے سے قد کا ایک آدمی دکھائی دیا۔شہزادہ اس کی طرف بڑھا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور ایک عجیب سی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔''

''مگر تم ہو کون؟'' شہزادے نے پوچھا۔اس نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا تو شہزادے کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔اس بونے کا ہاتھ باغ کے بلند درختوں کے اوپر تک پہنچ گیا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے درختوں کو یوں ہلا رہا تھا جیسے درخت نہ ہوں گھاس کے تنکے ہوں۔شہزادہ سہم گیا مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''یاد رکھو اگر تم نے بدیع الجمال کے خواب دیکھنا ترک نہ کیا
تو اس محل سمیت زمین میں دھنسا دوں گا۔''

شہزادے نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شہزادے کو انگارے سے

دہکتے دکھائی دیے۔

''دیکھو تم سے میری کوئی دشمنی نہیں، نہ میں تمہیں جانتا ہوں پھر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو اور بدیع الجمال سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

شہزادے نے بہت دھیمے لہجے میں کہا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بونا دیر تک اسے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''میں کوہِ قاف سے آیا ہوں۔ میرے سوا کوہِ قاف میں ابھی تمہاری اور بدیع الجمال کی ملاقات کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں کہ تم اپنی اوقات میں رہو ورنہ سب کچھ جلا کے راکھ کر دوں گا۔''

یہ کہہ کر اس بونے نے اپنا ایک ہاتھ پھیلایا تو اس کی ہتھیلی پھیل کر کشتی جتنی بڑی ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے گھوڑا اٹھا کر اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا اور شہزادے کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا باغ سے باہر نکل گیا۔ دُھواں اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ شہزادے نے سوچا کہ اب اس کا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔

شہزادہ سیف الملوک اس صورتِ حال کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ سوچتے سوچتے اس کا ذہن بوجھل ہو گیا تھا۔ پریشانی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ایک سہ پہر اس نے اپنے مصاحبِ خاص صاعد کو طلب کیا اور اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر کے اس سے مشورہ مانگا۔شہزادے کی بات سن کر صاعد کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی۔ پہلے تو اسے شک سا گزرا کہ کہیں شہزادے نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جسے وہ حقیقت سمجھ بیٹھا ہے لیکن جب شہزادے نے اس سے مشورہ مانگا تو وہ الجھ کر رہ گیا۔شہزادے کی نم آنکھوں اور لہجے کی نرمی سے صاعد نے یہ جان لیا کہ شہزادہ واقعی ایک غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہے۔

صاعد نے شہزادے سے کہا کہ وہ اس سارے مسئلے کا کوئی مناسب حل سوچے گا جس کے لیے اسے تھوڑا سا وقت چاہیے۔شہزادے نے کہا:

> ''میں عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں، میرا کیا بنے گا، یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے، چاہے تم اس بارے میں مجھے کوئی مشورہ نہ بھی دے پاؤ، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

صاعد نے سر جھکا لیا۔اسے اپنی بے بسی کا احساس کھائے جا رہا تھا۔وہ یہ سوچ رہا تھا کہ شہزادے نے زندگی میں پہلی بار اس سے کوئی مشورہ طلب کیا مگر اس کے پاس خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

شہزادے نے صاعد سے وعدہ لیا کہ وہ یہ بات اپنے تک محدود رکھے گا اور کسی حال میں بھی یہ راز کسی پر افشا نہیں کرے گا۔

☆

وہ اماوس کی ایک پچھلی رات تھی۔شہزادے کو اپنے کمرے میں وحشت سی ہونے لگی تھی۔اس نے سوچا کہ اسے باغ میں جا کر تازہ ہوا میں کچھ دیر چہل قدمی کرنی چاہیے۔وہ اپنے بستر سے اٹھا اور ایک بغلی دروازے سے ہوتا ہوا باغ کے اس کونے میں جا نکلا جہاں سے باغ کی حفاظت پر مامور سپاہیوں میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس نے جونہی باغ میں قدم رکھا اچانک باغ میں ایک مانوس سی مہک پھیل گئی۔۔شہزادہ اِس خوشبو سے اچھی طرح مانوس تھا۔اُسے معلوم تھا کہ اِس خوشبو کا منبع ایک غزالِ رم خوردہ کا ہیرے جیسا تراشا ہُوا بدن ہے۔وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔خوشبو تھی کہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ اس خوشبو میں بھیگا ہوا تھا بالکل اسی طرح جیسے وہ ایک دھندلی رات میں بھیگا تھا۔وہ جانتا تھا کہ یہ بدیع الجمال کی خوشبو ہے۔

''بدیع الجمال۔۔۔!''

شہزادے نے آواز دی تو خود اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود میں پروان چڑھتی محبت اس کی صدا کے ساتھ سارے میں بھر گئی ہے۔

''بدیع الجمال تم کہاں ہو؟ خدا کے لیے ایک بار میرے سامنے آ جاؤ۔''شہزادے کے لہجے میں التجا کا رنگ نمایاں تھا۔

''میں یہاں ہوں۔''اسے بدیع الجمال کی آواز تو سنائی دے رہی تھی لیکن وہ اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''کہاں؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اسے چبوترے کے پاس دکھائی دی، وہ دوڑتا ہوا چبوترے پر چڑھا اور بدیع الجمال سے لپٹ گیا۔

''بدیع الجمال، میری بدیع الجمال۔'' شہزادہ جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔

''میرے پاس وقت کم ہے۔'' بدیع الجمال نے کہا۔

''تو؟''

''تو یہ کہ مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔'' بدیع الجمال نے کہا۔

''میں تو صرف تمہیں اپنا گھوڑا دینے آئی ہوں، یہ تمہارے کام آئے گا۔'' بدیع الجمال نے گھوڑے کی طرف اشارا کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بدیع الجمال اچانک ہی غائب ہوگئی۔ وہ اسے پکارتا رہا مگر بدیع الجمال وہاں سے جا چکی تھی۔ مشعل بدست سپاہی باغ میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ شہزادے نے گھوڑے کی لگام تھامی اور باغ میں سپاہیوں کے درمیان جا پہنچا۔ سپاہی دست بستہ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے گھوڑا ایک سپاہی کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ وہ صرف اس گھوڑے کی حفاظت اور دیکھ بھال پر مامور رہے، کوئی اور کام نہ کرے۔

وُہ ساری رات شہزادے نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ غیر معمولی واقعات و حادثات کا سلسلہ ایک بار پھر اپنی پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ شہزادہ دیر تک اِسی بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کس وقت نیند کی دیوی نے اُس کی بوجھل پلکوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور

وُہ گہری نیند سو گیا۔

اُس رات شہزادے نے خواب میں اُس مردِ درویش کو دیکھا۔ وُہ شہزادے سے کہہ رہا تھا کہ اُس مہ جمال نے تجھ پر مہربان ہو کر اپنا رخشِ صبا خرام تجھے تحفے میں دے دیا ہے۔ اِس گھوڑے پر سوار ہو کر تُو اُس وادی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جہاں ایک جھیل کے کنارے تیری اُس سے ملاقات ہو گی۔

شہزادہ جب بیدار ہُوا تو اُس کے سر میں سفر کا سودا سمایا ہُوا تھا۔ وُہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سفر پر روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ سو وُہ بادشاہ سلامت کے حضور جا پہنچا اور نہایت لجاجت سے اپنا مدعا بیان کیا۔ بادشاہ سلامت کے ذہن میں ایک بار پھر جوتشی کے الفاظ ابھرنے ڈوبنے لگے۔ شہزادے کی عمر کا یہ سولہواں سال تھا اور اِس سال وُہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وُہ تو شہزادے کی عمر کے پل پل کا حساب رکھتے تھے۔ پونم کی راتیں چار دفعہ اور سرائے دہر کو اجالیں گی، تب کہیں جا کر وُہ سکھ کا سانس لیں گے۔ چار ماہ تک تو وُہ کسی طور شہزادے کو خود سے جدا نہیں کر سکتے تھے لیکن وُہ شہزادے کی بے قراری کو بھانپ چکے تھے اور اُنہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شہزادے کو آسانی سے رام نہیں کیا جا سکتا۔ وُہ طرح طرح کے بہانے بنا رہے تھے اور شہزادہ طرح طرح کے راستے نکال رہا تھا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ چار ماہ بعد شہزادہ سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمراہ سفر پر روانہ ہو گا۔ شہزادہ جب شاہ عاصم سے سفر کرنے کی اجازت حاصل کر چکا تو وُہ اپنے طور پر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا مگر شاہ عاصم کو اب کسی طور قرار نہیں آ رہا تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی کا غم اُنہیں اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وزیرِ خاص صالح بن حمید، شاہِ مصر کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے چند دوسرے وزرائ سے مشورہ کرنے کے بعد بوڑھے جوتشی کو

ایک بار پھر محل میں طلب کر لیا۔

جوتشی نے حسبِ سابق اِس بار بھی زائچے بنائے، فالیں نکالیں، ستاروں کی برجوں میں حرکت کو کئی کئی زاویوں سے دیکھا لیکن شہزادہ سیف الملوک اور شاہ عاصم کے درمیان ایک لمبی جدائی اور شہزادے کی زندگی کو لاحق خطرات کے سوا اُسے کہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اُس نے نہایت محتاط انداز میں وزیرِ خاص کو بتایا کہ شہزادے کو کسی نہ کسی طرح اِس سفر سے باز رکھا جائے۔ وزیرِ خاص کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ جب وُہ ساری صورتِ حال سے بادشاہ سلامت کو آگاہ کریں مگر اِسی دوران میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ شہزادہ سیف الملوک ایک صبح اپنے کمرے میں بے ہوش پایا گیا۔ شہزادے کے نازک جسم پر جگہ جگہ زخم آئے ہوئے تھے اور اُس کے پاؤں میں بھاری زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ شہزادے کے کمرے میں سلیقے سے رکھی ہوئی چیزیں فرش پر اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں اور اُن میں سے اکثر ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے میں کئی افراد آپس میں لڑتے رہے ہیں۔

شاہی طبیب شہزادے کو ہوش میں لانے کے جتن کر رہا تھا۔ بادشاہ سلامت وضع داری نبھا رہے تھے مگر اُن کے دل کی حالت اُن کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ وزیرِ خاص صالح بن حمید بے چینی سے طبیب کو دیکھے جا رہے تھے۔ کسی سے کچھ بن نہیں پڑ رہا تھا۔

اِسی عالمِ بے قراری میں خدا خدا کر کے شہزادے کی پلکوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ شاہی طبیب نے داد طلب نظروں سے بادشاہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے وزیر کو اشارے سے بتایا کہ طبیب کو مالا مال کر دیا جائے۔ اِسی دوران میں شہزادے کے پاؤں

میں پڑی ہوئی زنجیریں بھی کھول دی گئیں اور اُس کے زخموں پر مرہم بھی رکھ دیا گیا۔

اُس دن وقفے وقفے سے شہزادے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہزادہ اپنے آپ میں نہیں۔ اُس پر جس وقت یہ کیفیت طاری ہوتی وُہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ بہت کوشش کے بعد اُس کی بس اتنی سی بات سمجھ میں آئی کہ اُسے بدیع الجمال بلا رہی ہے۔ وُہ سارا دن اِسی ادھیڑبن میں گزر گیا۔ شام ہوتے ہی شہزادہ گہری نیند سو گیا۔ شاہ عاصم، وزیرِ خاص اور شاہی طبیب ساری رات شہزادے کے سرہانے بیٹھے رہے۔

دوسری صبح جب شہزادہ نیند سے بیدار ہُوا تو وُہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ البتہ اُس نے اپنے باپ سے صرف اتنا ضرور کہا کہ اُسے ہنسی خوشی سفر پر روانہ ہونے کی اجازت نہ دی گئی تو وُہ زہر کھا لے گا۔ بیٹے کی اِس شدید خواہش کے سامنے باپ کو چار و ناچار ہتھیار ڈالنے پڑے۔ انہوں نے شہزادے سے وعدہ کیا کہ وقتِ مقررہ پر وُہ اُسے بہر طور سفر پر خود روانہ کر دیں گے۔

شہزادے نے باپ کو یہ نہیں بتایا کہ اُس کی منزل کہاں ہے کیونکہ اپنی منزل کا خود اسے بھی کچھ پتا نہ تھا۔ اُس نے تو اپنے باپ کو بس یہ بتایا تھا کہ وُہ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک وادی میں جانا چاہتا ہے۔

سفر کی ساری تیاری ہو چکی تھی۔ گھوڑوں پر رختِ سفر باندھا جا چکا تھا اور

تیروں،تلواروں سے مسلح گھڑسوار کوچ کا نقارہ بجنے کے منتظر تھے۔شہزادے کوالوداع کہنے کی غرض سے جب بادشاہ سلامت باغ میں تشریف لائے تو یہ منظر بہت دیدنی تھا۔بادشاہ سلامت کی بھیگی ہوئی پلکیں اِس امر کی عکاس تھیں کہ اُن کے اندر کوئی چیز بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے مگر اُنہوں نے صبر کا دامن تھام رکھا تھا۔شہزادے نے آگے بڑھ کر اُن کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔اُنہوں نے شہزادے کو گلے لگالیا اور ایک مرتبہ پھر تاکید کی کہ بیٹا جلد واپس آجانا،اب میں چراغِ سحری کے مانند ہوں۔واپس آکر تمہیں ہی سلطنت کا نظم ونسق سنبھالنا ہے۔

شہزادہ سیف الملوک نے اپنے بوڑھے باپ سے وعدہ کیا کہ وُہ جلد واپس لوٹ آنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن اسے بخوبی علم تھا کہ اب واپس آنا اس کے اختیار میں نہیں ۔باپ کوالوداعی بوسہ دینے سے پہلے شہزادہ اپنی ماں کی قبر پر گیا اور قبر سے لپٹ کر خوب رویا۔قبر کی خشک مٹی کواس کے آنسو تو کیا نم کرتے لیکن اسے ایسا لگا جیسے اس کا پورا وجود بھیگا ہوا ہے اور اسے اس حال میں دیکھ کر اس کی ماں قبر کے اندر بھی بہت بے چین ،بہت بے قرار ہورہی ہے۔ایک بار تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ماں نے نام لے کر اسے پکارا ہو۔اس نے بھیگی پلکیں کھولیں تو قبر کی اداس مٹی نے اسے رنجیدہ کر دیا۔اس نے سوچا اگر وہ ایک لمحہ بھی یہاں اور ٹھہرا تو شاید وہ پتھر کا ہو کر یہیں رہ جائے گا۔وہ واپس پلٹا،ماں کی قبر پر آخری نظر ڈالی اور ایک بار پھر اپنے باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

’’بیٹا!میں نے تمھیں راتوں کو جاگ جاگ کر سجدوں میں خدا سے مانگا ہے۔میرا بس چلے تو میں ایک لمحے کے لیے بھی تمھیں اپنے آپ سے جدا نہ ہونے دوں مگر میں مجبورِ محض ہوں ،میرے بس میں کچھ بھی نہیں ۔تم نہیں جانتے کہ باپ کی محبت کیا ہوتی ہے۔میں نے

بزرگوں سے سنا ہے کہ باپ کی محبت ایک حجاب ہے۔''

شہزادہ باپ کی یہ بات سن کر زمین پر بیٹھ گیا۔اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا اور اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اس کے ذہن میں اپنے باپ کے الفاظ گونج رہے تھے، باپ کی محبت ایک حجاب ہے، حجاب ہے، حجاب ہے۔شہزادے کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کے جسم میں اب اتنی سکت بھی نہیں کہ اٹھ کر اپنے باپ کے گلے لگ جائے۔جانے کتنی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔اپنے شانے پر باپ کے شفقت بھرے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تو اس کی جان میں جان آئی۔وہ اٹھا اور باپ سے لپٹ گیا۔وہ روتا رہا اور اس کے آنسو بادشاہ سلامت کے شانوں پر گرتے رہے۔بوڑھے باپ کے ناتواں شانوں پر نوجوان بیٹے کے آنسو جانے کیسا بوجھ تھا کہ بادشاہ سلامت سارا رکھ رکھاؤ بھول گئے اور انھوں نے ایسی آہ بھری کہ شہزادہ سہم کر ان سے الگ ہو گیا اور انھیں یوں دیکھنے لگا جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

باپ اور بیٹے کے ارد گرد بہت سے لوگ تھے لیکن ایک خاموشی تھی جس کا کوئی انت نہ تھا۔ماحول بہت سوگوار تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے میں کیا جانا چاہیے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور ماحول کی اداسی کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔ہر شخص سے دکھ کی ایک آکاس بیل لپٹی ہوئی تھی جو بدن سے خون چوس رہی تھی۔اچانک شہزادے کے گھوڑے نے بے طرح ہنہنانا شروع کر دیا اور اپنے اگلے پاؤں فضا میں بلند کر دیے۔جس نے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی وہ ایسا سہما کہ اس کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی۔شہزادے نے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لی تو گھوڑا پر سکون ہو گیا۔

شہزادے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا گویا جانے کی اجازت چاہتا ہو۔بادشاہ

سلامت نے بہت دھیمے لہجے میں کہا:

''بیٹا! ہو سکے تو کبھی کبھی اپنے باپ کو یاد کر لینا۔''

شہزادہ ایک بار پھر باپ سے لپٹ گیا۔

اُس رشکِ ماہ کے تخفتاً دیے ہوئے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے شہزادے نے ایک نظر محل کو دیکھا۔ اُس ایک نگہ میں جانے کیا تھا کہ بادشاہ سلامت کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور آنسو اُن کی پلکوں سے ہو کر ان کے چہرے کی دراڑوں میں جذب ہونے لگے۔ شہزادہ یہ منظر نہ دیکھ سکا اور جلدی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اُس کے سوار ہوتے ہی کوچ کا نقارہ بجنے لگا، علم بلند ہُوا اور قافلہ روانہ ہو گیا۔

گھوڑوں کی اڑائی ہوئی گرد میں شاہِ مصر کے زندگی بھر کے خواب گُم ہوتے رہے اور وُہ جاتے ہوئے قافلے کو بہت دُور اور بہت دیر تک عجیب حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ قسمت نے اُنہیں یہ کیسی جگہ لا کھڑا کیا تھا کہ وُہ اپنی دنیا کو برباد ہوتا دیکھ رہے تھے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

شہزادے کا گھوڑا ایک انجانے راستے پر بھاگا جا رہا تھا اور اُس کے پیچھے دُھول اُڑاتا

قافلہ رواں دواں تھا۔ قافلے والوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اُن کے رہبر شہزادے کو خود بھی اپنی منزل کا پتہ نہیں اور اِس سفر میں وُہ ایک بے زبان گھوڑے کی رہبری میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

شہزادے نے گھوڑے کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ شام کے وقت گھوڑا ایک دریا کے کنارے جا کر رُک گیا۔ یہ اِس بات کا اشارہ تھا کہ آج کی رات قافلے کو یہاں پڑاؤ ڈالنا ہے۔

شہزادہ گھوڑے سے اُترا تو سپاہیوں نے فوراً خیمے نصب کرنا شروع کر دیے۔ الاؤ روشن کر دیا گیا اور پتھروں کے چولہے بنا کر اُن پر دیگیں رکھ دی گئیں۔ شہزادے نے دریا کے ٹھنڈے پانی سے اپنی پلکوں پر جمی گردِ سفر کو دھویا۔ شہزادے کے لیے خیمے میں بستر لگا دیا گیا تھا۔ دن بھر کے سفر سے شہزادے کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تکیے سے ٹیک لگا کر اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اِس عمل سے اُسے اتنی راحت ملی کہ اُسے نیند آنے لگی لیکن وُہ جانتا تھا کہ اُس کی خدمت کے لیے ساتھ آئے ہوئے غلام اُسے کچھ کھائے پیے بغیر سونے نہیں دیں گے۔

شہزادہ اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اُسے خیمے کے باہر شور سنائی دیا۔ وُہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھا کہ معلوم کر سکے کہ کیا مُعاملہ ہے۔ جونہی وُہ خیمے سے باہر نکلا اُسے سپاہیوں کے جھرمٹ میں وُہی مردِ درویش نظر آیا۔ وُہ بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھا اور درویش کے پاؤں پکڑ لیے۔ سپاہی شہزادے کا یہ انداز دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے اور شہزادہ درویش کو لے کر اپنے خیمے میں آ گیا۔ شہزادے نے درویش کو اپنے بستر پر بٹھایا اور خود اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''بابا ! آپ یہاں کیسے؟''

''میں یہاں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے۔معمولی سی لغزش تمہیں اور تمہارے قافلے کو موت کے منہ میں دھکیل دے گی۔اِس لیے میری بات غور سے سننا، میرے کہے سے سرِ مُو انحراف نہ کرنا۔''

شہزادے نے کہا کہ بابا آپ جیسے کہیں گے، جو کہیں گے، میں بالکل اسی طرح کروں گا۔

درویش نے اس کے سر ہاتھ رکھا اور کہا:

''سنو !جس دن سورج گہن میں ہوگا ، اُس شام تمہارا قافلہ دیودار کے ایک گھنے جنگل میں پڑاؤ ڈالے گا۔اُس رات تمہیں اپنے خیمے کے باہر اکتارے کی آواز سنائی دے گی۔ تُم اپنے خیمے سے باہر نکل جانا۔باہر ایک بیراگی اکتارے سے ملتے جلتے ساز پر ایک دُھن بجا رہا ہوگا۔ تُم وہیں بیٹھ جانا۔اُس بیراگی کے گلے میں سُچے موتیوں کی ایک مالا ہوگی۔جب وُہ عالمِ وجد میں رقص کرنے لگے،تُم اُس سے مالا مانگ لینا۔مالا حاصل کرتے ہی اپنے خیمے میں واپس آجانا اور پھر خیمے سے باہر نہ نکلنا۔ دوسرے دن شام سے پہلے تُم ایک پہاڑی راستے سے ہوکر دریا کو عبور کر کے ایک وادی میں پہنچو گے۔یہاں سے تمہاری منزل بہت قریب ہو گی۔ایک رات یہیں پڑاؤ ڈالنا اور دوسرے دن

اپنے آدھے قافلے کے ساتھ پھر سے سفر کا آغاز کرنا۔ سفر آغاز کرتے ہی تُمہیں اپنی بائیں جانب ایک بلند پہاڑ نظر آئے گا۔ تھوڑا آگے چل کر تمہیں ایک برفانی تودہ دکھائی دے گا۔ اِس تودے کو عبور کرنے کے بعد تمہارا گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے لگے گا۔ راستے میں تُمہیں ایک کھوکھلا درخت نظر آئے گا۔ اس درخت کے تنے پر تلوار کا نشان ہوگا۔ یہاں سے آگے تُمہیں کسی کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں۔ میری انگوٹھی اور بیراگی کی مالا ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ یاد رکھنا تُمہاری منزل ایک جھیل ہے۔''

اتنا کہہ کر درویش اپنی جگہ سے اُٹھا۔ شہزادے نے درویش کا دامن پکڑ لیا لیکن اُس مہربان درویش نے شہزادے کو راستے سے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ شہزادہ احساسِ تشکر کے ساتھ جاتے ہوئے درویش کو دیکھتا رہا۔

کئی دن کے مسلسل سفر اور کئی راتوں کو مختلف مقامات پر پڑاؤ کرنے کے بعد ایک دن دوپہر کے بعد شہزادے نے محسوس کیا کہ سورج کی روشنی پھیکی پڑ رہی ہے اور اُس کی حدت میں کمی آ رہی ہے۔ شہزادے نے دُزدیدہ نگاہوں سے سورج کی طرف دیکھا۔ سورج گرہن کے آثار بالکل نمایاں تھے۔ شہزادے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب وُہ اپنی منزل سے کچھ زیادہ دُور نہیں تھے۔

شام تک شہزادے کا قافلہ دیودار کے گھنے، ٹھنڈے اور مہکتے جنگل میں داخل ہو گیا۔ایک مناسب جگہ پر خیمے نصب کر دیے گئے اور سپاہی کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگے۔شہزادہ بے چینی سے اپنے خیمے کے باہر ٹہل رہا تھا۔جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو وُہ اپنے خیمے میں آ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

شہزادے کو رہ رہ کر بدیع الجمال یاد آ رہی تھی۔اس کی خوشبو سے اب بھی شہزادے کے مشامِ جاں مہک رہے تھے۔وہ خیالوں ہی خیالوں میں بدیع الجمال سے مخاطب تھا۔

وُہ کیسی پہاڑ سی رات تھی جو کسی طور گزر ہی نہیں رہی تھی۔رات کے پچھلے پہر شہزادے کو خیمے کے باہر ایک مدہم سی آواز سنائی دی۔اِس پل کا اُسے شدت سے انتظار تھا۔وُہ پلک جھپکتے میں خیمے سے باہر نکلا۔خیمے کے باہر ہلکی روشنی میں اُسے ایک بوڑھا شخص دکھائی دیا۔وُہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اُس شخص کے بالکل قریب پہنچ گیا۔وُہ ایک بیراگی تھا جو ایک عجیب سے ساز پر اپنی ہی دُھن میں کچھ گائے جا رہا تھا۔اُس کے گلے میں چمکتے ہوئے موتیوں کی مالا صاف نظر آ رہی تھی۔بیراگی دیر تک دُھن بجاتا رہا۔پھر وُہ اپنے ایک پاؤں پر ہولے ہولے اوپر اُٹھنے لگا،اور پھر عالمِ وجد میں رقص کرنا شروع کر دیا۔شہزادہ چند لمحے اُسے محویت سے دیکھتا رہا۔بیراگی کے لمبے بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بادلوں کی طرح اس کے شانوں اور چہرے پر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔جب وہ مستی کے عالم میں سر کو ایک طرف جھٹکا دے کر بالوں کو پشت کی جانب ڈالتا تو شہزادے کو ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ دکھائی دیتا جو اگلے ہی لمحے پھر لمبے بالوں میں چھپ جاتا۔کئی بار تو شہزادے کا جی چاہا کہ وہ بھی بیراگی کے ساتھ ناچنا شروع کر دے اور ساری دنیا سے بے گانہ ہو جائے۔یہ رات، یہ گھنا جنگل اور بیراگی کی یہ کیفیت ،شہزادہ تو جیسے کسی نئے جہان میں نکل گیا

تھا۔اچانک اسے یاد آیا کہ جذب و کیف کی یہ دنیا کہیں اسے اس کے مقصد سے دور نہ کر دے اور وہ ناچتے ناچتے کہیں اور نہ نکل جائے۔ یہ خیال اسے اپنی دنیا میں واپس لے آیا اور پھر اچانک اُس نے اُس بیراگی کو آواز دی:

''بابا ! اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا مجھے دے دو۔''

بیراگی نے اُسی عالم میں رقص کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنے گلے سے مالا اُتاری اور شہزادے کو تھما دی۔ مالا حاصل کرتے ہی شہزادہ اپنے خیمے کی طرف لپکا۔کسی نے اُس کا نام لے لے کر اُسے بار بار پکارا۔ایک دفعہ تو اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے اُس کا دامن پکڑ لیا ہے لیکن اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔

خیمے کے باہر کوئی اب بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا، اُسے پکار رہا تھا۔پھر یہ ایک آواز کئی آوازوں میں تبدیل ہو گئی لیکن شہزادے نے اِن آوازوں کی طرف مطلق دھیان نہ دیا۔دفعتاً اُسے ایسا لگا جیسے بہت سے افراد مل کر اُس کے خیمے کو اُکھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔شہزادے نے خیمے کے پردے کو ایک کونے سے ذرا سا سرکایا اور باہر جھانکنے لگا۔اُس نے دیکھا کہ بیراگی اُسی محویت سے رقص میں مصروف ہے لیکن اب اس کے قریب الاؤ بھڑک رہا ہے جس کے شعلے درختوں کی شاخوں کو چھو رہے ہیں۔ بیراگی رقص کرتے ہوئے بار بار اس الاؤ کے قریب آتا ہے، اپنا داہنا ہاتھ شعلوں میں ڈالتا ہے اور پھر ہاتھ کو یوں اپنے منہ تک لے جاتا جیسے آگ پی رہا ہو۔دیکھتے ہی دیکھتے اس نے یہ سارا الاؤ پی لیا۔جب آگ بجھ گئی تو بیراگی وہیں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔

بہت دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں ، اِدھر اُدھر دیکھا۔معاً اسے اپنی مالا کا

خیال آیا تو اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گلے کی مالا کو چھونے کی کوشش کی مگر مالا تو وہ شہزادے کو دے چکا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ مالا اس کے گلے میں موجود نہیں تو وہ دیوانہ وار اسے ڈھونڈنے لگا۔ بجھے ہوئے الاؤ کی راکھ میں اس نے انگلیاں پھیریں، جھک جھک کے زمین پر ڈھونڈا، درختوں اور جھاڑیوں کو کھنگالا مگر مالا کہیں ہوتی تو اسے ملتی۔

جب اسے مالا نہ ملی تو اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد نصب خیموں کی جانب دیکھ بھی نہیں رہا تھا جیسے وہاں کوئی خیمہ ہی نہ ہو۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ سارا جنگل اس کی چیخوں سے گونج رہا تھا لیکن کسی خیمے سے کوئی شخص باہر نہیں آیا تھا۔ شہزادے کو خیال آیا کہ جیسے اس بیراگی کی چیخیں اس کے سوا کوئی بھی نہیں سن رہا۔

بیراگی دیر تک اسی طرح چیختا چلاتا اور مالا ڈھونڈتا رہا۔ جب اسے مالا نہ ملی تو وہ ایک درخت کے تنے سے لگ کے بیٹھ گیا اور اپنی کٹے پھٹے چُغے کی جیب سے مٹی کا ایک دیا نکالا، اسے ایک پتھر پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے اسے رگڑنے لگا۔ دیے کے کناروں سے پہلے کچھ چنگاریاں اڑیں، پھر دفعتاً دیا روشن ہو گیا اور اس کی روشنی سارے میں پھیل گئی۔ اب شہزادے کو ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بیراگی نے دیے کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کی نظر خیموں پر پڑی۔ اس نے دیا ہاتھ میں لیا اور سیدھا شہزادے کے خیمے کی جانب لپکا۔

اسے اپنے خیمے کی جانب آتے دیکھ کر شہزادے کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے بس ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں یہ بیراگی اس سے اپنی مالا چھین نہ لے۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا ۔اب اسے بیراگی دکھائی نہیں دے رہا۔ اس نے کان خیمے کے باہر کی آوازوں پر لگائے

ہوئے تھے لیکن اسے کہیں سے کوئی آواز، کوئی آہٹ سنائی نہ دے رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد اس نے ایک بار پھر خیمے کے کونے سے پردے کو ذرا سا سرکا کر باہر دیکھا تو اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا کیوں کہ باہر ہر سو تاریکی کا راج تھا۔

خوف کی ایک لہر اُس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ شہزادے کو درویش کی نصیحت یاد آ گئی۔ اُس نے اپنے خیمے میں جلتا ہُوا چراغ گُل کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

اُس کے گلے میں پڑی ہوئی مالا کے موتیوں سے پھُوٹتی لَو سے خیمے میں دودھیا سا اجالا ہو گیا تھا۔ ہر سُو دیودار کے پیڑوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وُہ سفر کی ساری صعوبتیں بھول چکا تھا۔ اُس کے دل پر کسی کی یاد کے نرم پاؤں پڑ رہے تھے اور اُس کی نیم وا آنکھوں میں کسی کے خدوخال ابھر رہے تھے۔

پہاڑ کے سینے سے خنجروں کی طرح نکلی ہوئی چٹانوں کے بیچوں بیچ تنگ پگڈنڈی ایک جگہ سے بل کھا کر نیچے کی طرف مڑ گئی تھی۔ موڑ مڑتے ہی شہزادے کو نیچے دُور چمکتا ہُوا دریا اور اُس کے ساتھ ساتھ میلوں تک پھیلی ہُوئی خوبصورت وادی دکھائی دی۔ اُس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ وُہ اِس منظر کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ پتھروں سے سر ٹکراتا ، جھاگ اُڑاتا دریا، سرسبز وادی اور دیودار کا گھنا جنگل اُسے ایک عجیب عالم ِ سرخوشی سے ہمکنار کر رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ قسمت اُسے نجانے کہاں لے آئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی نگاہوں کے سامنے اپنے بوڑھے شفیق باپ کا چہرہ آ گیا۔ اُس نے سوچا کہ

جانے اُس کی جدائی نے اُس کے مہربان باپ کو کس اذیت سے دوچار کیا ہوگا۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اِن میں نقش اُس کے باپ کے چہرے کے خدوخال دھندلا گئے۔

گھوڑا اب آہستہ آہستہ نیچے وادی کی طرف اُتر رہا تھا۔

شہزادہ سیف الملوک

ناراں میں

دریا عبور کرنے کے بعد قافلے نے پہاڑ کے دامن میں خیمے لگا لیے۔ سپاہی حسبِ معمول اپنے فرائض کی بجا آوری میں جُت گئے۔شہزادہ دریا کے کنارے بیٹھا دریا میں کنکریاں پھینکے جا رہا تھا۔اُس کی منزل اب اُس سے بس ایک رات کے فاصلے پر تھی۔شام کے سائے ہولے ہولے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔چاند بادل کے ایک ٹکڑے کی اوٹ سے چُھپ چُھپ کر شہزادے کو دیکھ رہا تھا۔ہوا دیودار کے پیڑوں سے سرگوشیوں میں مصروف تھی اور شہزادہ خیالوں ہی خیالوں میں اُس اپسرا سے مخاطب تھا جس کے وصال کی آرزو اُسے گھر سے اتنی دُور اِس وادی میں کھینچ لائی تھی۔ شہزادے کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔شاید وُہ اُس کی آواز سن رہی ہو۔۔۔شاید !

میرے زانو پہ سوئی ہوئی رات جاگے

تو میں کُھل کے اک بار پھر

سانس لوں

بانسری کو کسی اَن چھوئے گیت سے

زندگی بخش دوں

موسموں کے تغیر سے جو

ماورا ہو

کسی ایسے کنجِ ملاقات میں

اپنی گدڑی بچھاؤں

اُفق پر دھرے چاند کو

تیری جانب یہ پیغام دے کر روانہ کروں

جان!

مجھ کو ستاروں کی ترتیب بدلے ہوئے

کتنا عرصہ ہُوا۔

شہزادے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں کو اکھٹا کیا اور اُنھیں بتایا کہ اب منزل قریب ہے اور راستہ کٹھن، اِس لیے جو واپس جانا چاہے اُسے اجازت ہے۔ سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نگاہوں نگاہوں میں باتیں ہوئیں۔ پھر ایک جی دار کھڑا ہُوا اور شہزادے کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

> ’’شہزادۂ عالم پناہ ! ہم اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ یہاں تک آئے ہیں۔ ہم آپ کو یہاں چھوڑ کر واپس جانے پر اپنی موت کو ترجیح دیں گے۔‘‘

شہزادے نے سپاہیوں کا یہ جذبہ دیکھا تو خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اپنے قافلے کے آدھے سپاہیوں کو یہیں قیام کا حکم دے کر شہزادہ باقی قافلے کے ساتھ جھیل کی طرف

روانہ ہو گیا (اس جگہ اب ناران کا قصبہ ہے جسے سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے)۔لگتا تھا شہزادے کا گھوڑا اِن بل کھاتے راستوں کے پیچ وخم سے بخوبی آگاہ ہے۔شہزادے نے پیار سے گھوڑے کو تھپکی دی۔

چلتے چلتے شہزادے کا گھوڑا برف کے ایک بڑے تودے کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔بائیں طرف سے ایک پگڈنڈی پہاڑ پر دُور تک اوپر کو چڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔شہزادے نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ آدھے لوگ اِس پہاڑ پر جانے والے راستے کی طرف مڑ جائیں۔(اِس پہاڑ کو مقامی لوگ ''لیدا'' کہتے ہیں)

حکم ملتے ہی کچھ سپاہیوں نے قافلے سے الگ ہو کر اپنے گھوڑے اس پگڈنڈی پر ڈال دیے۔اب شہزادے کے ساتھ محض چند سپاہی اور کچھ گھوڑے تھے،جن پر اشیائے خورد نوش بندھی ہوئی تھیں۔برف کے تودے کے اُس پار ہوتے ہی شہزادے کا گھوڑا دائیں طرف مڑ گیا۔اب یہاں کوئی پگڈنڈی تھی نہ راستہ مگر شہزادے کا گھوڑا دھیرے دھیرے پہاڑ پر چڑھتا جا رہا تھا۔

شہزادے کے ہمراہیوں کو اب مشکل کا سامنا تھا کیونکہ اُن کے گھوڑوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔اِس صورتِ حال نے شہزادے کو دوہری اذیت سے دوچار کر دیا تھا۔ایک تو وُہ جلد سے جلد جھیل پر پہنچ جانا چاہتا تھا اور دوسرے یہ کہ ایک خاص مقام پر اب اسے اپنے ہم راہیوں سے جدا ہونا تھا کہ اس سے آگے اسے کسی کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ تھی۔

جب سپاہیوں سے کچھ نہ بن پڑا تو شہزادہ اپنے گھوڑے سے نیچے اُترا۔اُس نے ایک ایک کر کے سب گھوڑوں پر پیار سے اپنا ہاتھ پھیرا۔ایسا کرتے ہوئے اُس نے

درویش کی دی ہوئی انگوٹھی کو اہتمام سے گھوڑوں سے مَس کیا۔شہزادے کے ایسا کرنے سے
گھوڑوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور اُنہوں نے آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا شروع کر دیا۔

سہ پہر کے وقت شہزادے کو وُہ کھوکھلا درخت دکھائی دیا جس کے تنے پر تلوار کا نشان بنا
ہُوا تھا۔(اِس جگہ کو اب ''ٹیہری'' کہا جاتا ہے۔)

شہزادہ یہاں پہنچ کر اپنے گھوڑے سے نیچے اُترا۔عجب یاس بھری نظروں سے
سپاہیوں کو دیکھا اور اُنہیں یہیں قیام کرنے کا کہہ کر دوبارہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔اپنے
قافلے کے آخری ہمراہیوں سے جدا ہوتے سمے شہزادے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اب شہزادے کا قافلہ صرف تین گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ایک گھوڑے پر شہزادہ خود سوار
تھا اور دو گھوڑوں پر کھانے پینے کی اشیا لدی ہوئی تھیں۔

شہزادہ سیف الملوک
جھیل پر

☆

یہ تیرا پری! پیار ہے؟ جس میں میں ہوں
اک کرب کی دیوار ہے جس میں میں ہوں
بےچینی کی اک کھوہ ہے جس میں دل ہے
تنہائی کا اک غار ہے جس میں میں ہوں
(صادقین)

برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے بیچ پیالے جیسی جھیل، شہزادے کو اپنے سارے حسن اور طلسم کے ساتھ زبانِ بے زبانی میں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ جھیل کی سطح پر ہَوا سے دائرے بن بگڑ رہے تھے اور اُس کا شفاف پانی آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ کہیں کہیں خودرو پھول مستی میں جھوم رہے تھے۔ برفیلی ہوا کے جھونکے شہزادے کے رگ و پے میں جیسے چھید ڈال رہے تھے۔ اتنی سردی کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

شہزادہ جھیل کے کنارے کنارے چلتا ہُوا کسی پناہ گاہ کی تلاش میں بہت دُور تک نکل گیا۔ جھیل کے مغربی کنارے پر شہزادے کو ایک پہاڑی کھوہ نظر آئی۔ وُہ اُس میں داخل ہو گیا۔ اُس کھوہ کا فرش ناتراشیدہ پتھروں سے بنا ہُوا تھا لیکن پتھر زمین میں اِس قرینے سے جمائے گئے تھے کہ فرش بالکل ہموار تھا۔ فرش کی طرح کھوہ کا سقف بھی ناتراشیدہ سرخ پتھروں سے مزین تھا۔ دیواریں اگرچہ خستہ مٹی کی تھیں لیکن اُن پر عجیب طرح کے نقش و نگار بنے ہُوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے برسوں کی محنت سے اِس کھوہ کو کسی عزیز ہستی کے لیے استوار کیا ہے۔ کھوہ کا مغربی حصہ بتدریج تنگ ہوتا ہُوا دُور تک چلا گیا تھا۔ اس ویران جگہ پر جہاں دُور تک کوئی ذی روح نہیں تھا، اِس کھوہ کی دریافت سے شہزادے کو قلبی طمانیت حاصل ہوئی۔

شہزادہ کھوہ سے باہر نکلا کہ گھوڑوں پر لدے ہُوئے سامان کو کھوہ میں لے آئے۔ کون جانے اُسے کب تک یہیں رہنا پڑے۔ شہزادہ جب کھوہ سے باہر نکلا تو ہلکا ہلکا اندھیرا چھا چکا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن اُسے اپنے گھوڑے کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔ وُہ

گھوڑوں کی تلاش میں دیر تک مارا مارا پھرتا رہا لیکن بے فائدہ۔ مایوس ہو کر وُہ واپس کھوہ میں آ گیا۔ اُس کے گلے میں پڑی ہوئی مالا کے موتیوں کی مدہم مدہم لَو کھوہ میں ہر سُو پھیلی ہُوئی تھی۔

کھوہ میں داخل ہوتے ہی اُسے کہیں قریب سے تازہ بُھنے ہُوئے گوشت کی خوشبو آئی۔ اُس نے دیکھا کہ فرش پر ایک طرف دستر خوان بچھا ہُوا ہے اور اُس پر مٹی کی بنی ہُوئی پلیٹوں میں بُھنا ہُوا گوشت، روٹیاں، چاول اور مشروبات قرینے سے سجے ہُوئے ہیں۔ شہزادے نے اس مختصر سی کھوہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں اُس کے سوا کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اِس سنسان جگہ پر اِس نعمتِ غیر مترقبہ کے ہاتھ آ جانے سے شہزادے کو گھوڑوں کے گُم ہو جانے سے ہونے والا نقصان یکسر بھول گیا۔

شہزادہ جب کھانا کھا چکا تو کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جوں جوں رات بیتتی جا رہی تھی، موتیوں کی روشنی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک شہزادے کی نظر اپنے دائیں طرف اُٹھی۔ وہاں اُسے ایک بستر بچھا ہُوا دکھائی دیا۔ اُس نے سوچا شاید بستر میں کوئی سو رہا ہے۔ وُہ اپنی جگہ سے اُٹھا، بستر پر پڑے ہوئے کمبل کو ایک جھٹکے سے اُٹھایا لیکن بستر خالی تھا۔

کئی دن اور کئی راتیں شہزادے نے اِسی طرح کاٹ دیں۔ اب اُسے اکلاپے سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ وُہ سارا دن جھیل کے کنارے بیٹھا رہتا یا ارد گرد ایستادہ پہاڑوں

کے دامن میں بچوں کی طرح برف سے کھیلتا رہتا۔تنہائی سے تنگ آ کرشہزادے نے کئی ایسے کھیل ایجاد کر لیے تھے جن سے دنیا کا کوئی دوسرا باشندہ واقف تک نہ ہوگا۔جھیل پر اُس کی بود و باش کے طور ہی جدا گانہ تھے۔ یہاں اُس نے اپنی ہی ایک دنیا بسا لی تھی، ایک ایسی دنیا جو صرف ایک انسان پر مشتمل تھی۔ اُسے کھانے پینے کی چنداں فکر نہیں تھی کہ یہ سب کسی نادیدہ ہستی نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔اُسے اپنی کھوہ میں کسی طرح کی کوئی تکلیف بھی نہ تھی۔اُس کی کھوہ موسموں کے تغیر سے ماورا تھی۔ یہاں کا اپنا ہی ایک موسم تھا، سرد نہ گرم۔لیکن وُہ بدیع الجمال کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔کئی دن گزر جانے کے باوجود بھی اُسے اُس بتِ رعنا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہَو سکا تھا۔اُس نے کئی بار درویش بابا کو بآوازِ بلند صدائیں دیں لیکن ہر طرف ہُو کا جو عالم تھا وُہ برقرار رہا۔

ایک رات شہزادہ اپنی کھوہ میں فرش پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔باہر چودھویں کے چاند کی دُودھیا روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔شہزادے کو اپنی کھوہ سے چاندنی میں نہائی ہُوئی جھیل واضح نظر آ رہی تھی۔وُہ اپنے خیالوں میں گُم سم بیٹھا تھا کہ اچانک ہر طرف اُسی غزالِ رم خوردہ کی مانوس مہک پھیل گئی جس کی محبت اُسے یہاں کھینچ لائی تھی۔شہزادہ کھوہ کے دہانے کی بائیں جانب پڑے ہُوئے ایک پتھر کی اَوٹ میں جا بیٹھا۔اُس نے دیکھا کہ وُہی بتِ غالیہ مُو اپنی سکھیوں کے ہمراہ جھیل کے کنارے کھڑی ہے۔وُہ سب بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں،ایک دوسری سی اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔شہزادے کو اُن کے قہقہے صاف سنائی دے رہے تھے۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن سب نے اپنی پوشاکیں اتارنا شروع کر دیں۔چاندنی اُن کے شفاف جسموں سے منعکس ہَو کر شہزادے کے بدن میں اتری جا رہی تھی اور اُسے اپنے

آپ سے بیگانہ کیے دے رہی تھی۔اُن برہنہ حسیناؤں کوایک دوسری سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ کرشہزادے کوایک لمحے کے لیے خود سے حیا آئی لیکن وُہ اپنی جگہ سے ذرا نہ سرکا۔

بہت دیر تک قہقہے گونجتے رہے۔پھر یہ برہنہ حسینائیں جھیل کے ٹھنڈے پانی میں اُتر گئیں۔اِس بلا کی سردی اور برفانی موسم میں اُنہیں پانی میں اُترتے دیکھ کرشہزادے کو یوں لگا جیسے وُہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔اُن کے جھیل میں اُترتے ہی پانی کا رنگ بدل گیا۔اُسے یوں محسوس ہَو رہا تھا جیسے پانی میں آگ لگ گئی ہے۔وُہ دیر تک نہاتی رہیں،ایک دوسری پر چھینٹے اُڑاتی اور قہقہے لگاتی رہیں۔شہزادے کو شک سا ہُوا کہ یہ انسان نہیں کوئی دوسری مخلوق ہیں۔اُسے ایک ایک کر کے اپنے ساتھ پیش آنے والے غیر معمولی واقعات یاد آنے لگے۔بدیع الجمال اور درویش بابا کے الفاظ اُس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

''میں دُور دیس کی باسی ہَوں۔''

''جس راستے پر تُم چل نکلے ہَو اس کی کوئی منزل نہیں۔''

''میں کوہِ قاف سے آیا ہوں۔''

شہزادے کو یقین ہَو گیا کہ وُہ ایک پَری کے حسن و جمال پر فریفتہ ہَو گیا ہے،وُہ ایک اپسرا پَر مرمٹا ہے۔

وُہ انہی خیالوں میں گُم تھا کہ حسینائیں جھیل سے باہر نکل آئیں اور پانی میں لگی ہَوئی آگ یکدم بجھ گئی۔اُن حسیناؤں نے اپنی اپنی پوشاکیں زیبِ تن کیں اور پھر آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہَونے لگیں۔شہزادہ اُنہیں فضا میں اوپر کو اُٹھتا دیکھ کر دنگ رہ گیا۔وُہ دیر تک اور دُور تک اُنہیں اوپر جاتے ہَوئے دیکھتا رہا۔جب وُہ نظر سے اوجھل ہَو گئیں تو شہزادہ سحر زدہ انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اپنی کھوہ میں واپس آ گیا۔

بدیع الجمال ۔۔۔۔اس کے ذہن میں ایک ہی نام گونج رہا تھا۔کیا وہ کوہِ قاف میں رہتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ اسے کیسے حاصل کرے گا؟ طرح طرح کے سوالات تھے جن کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ چودھویں کا چاند اب اس کی کھوہ کے دہانے کے اوپر سے آگے سرک گیا تھا اور پہاڑ کا سایہ اب آہستہ آہستہ جھیل کی سطح پر سرکتا ہوا اسے اپنی آغوش میں سمیٹتا جا رہا تھا۔ چاندنی جھیل کے پانی اور برف پر سے منعکس ہو کر پہاڑوں کے درمیان سارے میں یوں تھرتھراتی پھرتی تھی جیسے کسی سیال سے بھرے ہوئے پیالے کو کوئی ہلکی سی جنبش دے دے۔

رات کا کوئی پچھلا پہر تھا جب اسے دور سے آتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔اس نے کھوہ سے باہر نکل کر آواز کی سمت کا تعین کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آواز بیک وقت کئی سمتوں سے آ رہی ہے۔ چاندنی سے بھرے ہوئے پیالے میں اس آواز نے ایک عجیب ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چاندنی اس لبریز پیالے سے باہر چھلک پڑے گی ۔وہ برف پر چلتا ہوا جھیل کے ایک کنارے سے دوسرے تک جا پہنچا مگر یہ معلوم نہ کر پایا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ بالآخر وہ اس جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں سے جھیل کا پانی ایک ندی کی شکل میں نیچے وادی کی طرف بہتا تھا۔ وہ آواز کی سمت کا تعین تو نہ کر سکا تھا لیکن یہاں سے اسے آواز نسبتاً صاف سنائی دے رہی تھی ۔اس نے کان آواز پر لگا دیے۔ یہ کسی نوخیز دوشیزہ کی آواز تھی۔ وہ بہت مدہم مگر پرسوز آواز میں گا رہی تھی:

تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟

میں پربتوں کا رنج ہوں

میں وادیوں کی گونج ہوں

میں برف ہوں

میں آگ ہوں

میں رنگ ہوں

میں راگ ہوں

دیکھو تو میں اک سانس کی دوری پہ ہوں

ڈھونڈو مجھے تو میں نہیں

آؤ!

قریب آؤ مرے

میں روشنی دوں گی تمھیں

میں زندگی دوں گی تمھیں

آؤ!

قریب آؤ مرے۔۔۔!!

شہزادہ سیف الملوک اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

''بدیع الجمال۔۔۔!''

''بدیع الجمال۔۔۔!''

وہ ادھر ادھر بھاگتا اور بدیع الجمال کو پکارتا رہا۔ اس کی آواز برف کی چادر پر سے پھسل کر پہاڑوں سے ٹکراتی اور اس تک واپس آ جاتی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس

کی آواز دراڑوں سے بھر گئی ہے۔

آسمان سے آتے ہوئے برف کے بڑے بڑے گالے دیکھتے ہی دیکھتے جھیل کی سطح پر جمنے لگے۔ جھیل کا پانی پہلے نیلگوں سے سفید ہوا اور پھر اس میں پڑنے والا ہر عکس معدوم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جھیل اور پہاڑ بالکل ایک جیسے ہو گئے مگر برف باری کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ سردی اتنی بڑھی کہ شہزادے کو اپنی کھوہ میں پناہ لینا پڑی۔ کھوہ کا موسم اب بھی معتدل تھا اس لیے شہزادے کو موسم کی اس تلخی سے کسی طرح کی کوئی پریشانی نہ ہوئی البتہ اس مسلسل برف باری کی وجہ سے کھوہ کا دہانہ آہستہ آہستہ تنگ ہونے لگا تھا۔ شہزادے کو اب یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں کھوہ کا دہانہ بالکل بند ہی نہ ہو جائے۔ وہ بار بار اپنی جگہ سے اٹھتا اور کھوہ کے دہانے کے پاس آ کر باہر دیکھتا لیکن باہر برف کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔

رات کا کوئی سمے تھا جب وہ آخری بار کھوہ کے دہانے کے قریب آیا لیکن اس بار اسے باہر کا منظر دیکھنے میں ناکامی ہوئی کہ کھوہ کا دہانہ اب بند ہو چکا تھا۔ یہ بات اس کے مشاہدے میں اچھی طرح آ چکی تھی کہ اگر رات کو برف باری ہو تو تاریک رات بھی برف کی لَو میں نہا جاتی ہے اور ایسا گماں گزرتا ہے جیسے ہلکی ہلکی چاندنی سی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور اس لَو میں اردگرد کی چیزیں مدہم ہی سہی، دکھائی ضرور دیتی ہیں۔ اب یہ برف کی لَو بھی کھوہ کے بند دہانے کے ادھر کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بہت گھبرایا اور دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا

رہا، پھراسے جانے کب نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح کا کوئی وقت تھا جب اسے اپنی کھوہ کے باہر سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ جاگ چکا تھا لیکن آنکھیں کھولتے ہوئے اسے ڈر سا لگ رہا تھا کہ کھوہ کا دہانہ تو رات ہی کو بند ہو چکا تھا۔ اس نے کان اس آواز پر لگا دیے مگر وہ اس آواز کی نوعیت سمجھنے سے قاصر رہا کہ ایسی آواز اس نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔

ڈرتے ڈرتے اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی حتیٰ کہ کھوہ کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں کے خدوخال بھی بہت واضح تھے۔ اس نے بستر چھوڑ دیا اور کھوہ کے دہانے کی طرف لپکا۔ کھوہ کے دہانے کے سامنے جو برف کی دیوار سی بن گئی تھی اب اس کا نام ونشاں تک بھی باقی نہ تھا۔

وہ کھوہ سے باہر نکلا تو اسے ہر طرف برف ہی برف دکھائی دی۔ جھیل کی سطح پر بھی اتنی برف جم چکی تھی کہ اسے کہیں سے بھی جھیل کا صاف شفاف نیلگوں پانی دکھائی نہ دیا البتہ جھیل پر جمی برف پر اسے دور تک کسی کے قدموں کے نشان نظر آئے۔ وہ تیزی سے جھیل کی طرف بڑھا کہ اندازہ لگا سکے کہ اس برف باری میں جھیل کی جمی ہوئی سطح پر سے کون گزر را ہے اور یہاں سے گزر کر وہ کہاں گیا ہے۔

وہ جھیل کے قریب پہنچا تو قدموں کے نشان دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے کوئی ننگے پاؤں، اس کی کھوہ کے سامنے والے حصے سے جمی ہوئی جھیل پر سے چلتا ہوا مشرقی کنارے تک گیا ہے۔ اس نے اپنا ایک پاؤں احتیاط سے جھیل پر رکھا اور ہلکا سے دباؤ ڈال کر یہ اندازہ لگایا کہ کہیں اس کے بوجھ سے جھیل کی سطح پر جمی ہوئی برف ٹوٹ تو نہیں جائے گی لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ برف تو اب بالکل پتھر بن چکی ہے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا

کہ جھیل پر جمی برف اس جیسے کئی انسانوں کا بوجھ بھی سہار سکتی ہے تو برف پر بنے قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہی جھیل جس کے پانی میں بہت دور تک پھیلی ہوئے فلک بوس پہاڑوں کا عکس جھلملاتا تھا اب برف کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور وہ اس جھیل پر اس مزے سے چل رہا تھا جیسے کبھی یہاں پانی تھا ہی نہیں۔ وہ پاؤں کے نشانات کے ساتھ چلتے چلتے جھیل کے مشرقی کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اچانک ہی قدموں کے نشانات معدوم ہو گئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے برف پر ننگے پاؤں چلنے والے نے یہاں سے آگے کا سفر کیا ہی نہیں۔

شام ڈھلے تک وہ بار بار جھیل پر آتا اور اس کی جمی ہوئی سطح پر یہاں سے وہاں تک جاتا کہ شاید وہ یہ جان سکے کہ جھیل پر ننگے پاؤں کون چلتا رہا ہے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اب رات اپنے پنکھ بکھیرتی جا رہی تھی لیکن برف کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے اردگرد کی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور زمین پر ہر طرف برف ہی برف تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک بار پھر جھیل کے مشرقی کنارے تک جائے لیکن اس کے پاؤں نے اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی کھوہ میں واپس آ گیا۔

رات کا کوئی پہر تھا جب اس کی کھوہ میں اس کی جانی پہچانی خوشبو پھیل گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح دوڑتا ہوا کھوہ سے نکلا اور جھیل کی طرف لپکا۔ کھوہ سے نکلتے ہے اس کی نظر جھیل پر پڑی۔ وہ جھیل جو تھوڑی دیر پہلے تک برف میں لپٹی سو رہی تھی، اب اس سے جیسے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ جھیل کی سطح پر جمی برف بالکل پگھل چکی تھی اور پریاں اس میں اتری ہوئی تھیں۔

پریوں کے جھرمٹ میں اسے اپنی بدیع الجمال دکھائی دی جس کے انگ انگ سے رنگوں کی دھنک سی پھوٹ رہی تھی۔ اسے سب کچھ بھول گیا تھا، وہ تو بس بدیع الجمال میں کھو گیا تھا۔ یہ حسن اور اس پر یہ ادائیں، اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر پری سے لپٹ جائے لیکن اسے اس کی ہمت نہ ہوئی اور پھر آگ بجھ گئی، پریاں تاریک آسمان میں گم ہو گئیں اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

جانے وہ کب اپنی کھوہ میں آیا، کب اس کی آنکھ لگی اسے کچھ بھی یاد نہ تھا لیکن صبح جب اس نے جھیل دیکھی تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جھیل پر ہر طرف برف کی گہری چادر پڑی ہوئی تھی۔

شہزادہ سیف الملوک پر جانے کتنے موسم اِسی طرح بیت گئے۔ ہر ماہ کی چودھویں کو وُہ اپسرا اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھیل پر نہانے اُترتی تھی اور شہزادہ اُسے بس دُور ہی سے دیکھتا رہ جاتا تھا۔ کئی بار اُس نے فیصلہ کیا کہ وُہ آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ جائے اور برسوں کی ریاضت کے عوض اُسے اُس سے مانگ لے لیکن ہر بار کوئی نادیدہ ہاتھ اُسے آگے بڑھنے سے روک دیتا۔ کبھی کبھی شہزادہ اِس ساری صورتِ حال سے مایوس ہَو جاتا اور واپسی کا سوچنے لگتا۔ اُسے اپنے باپ کا شفیق چہرہ اور بھیگی ہَوئی آنکھیں یاد آتیں اور چند لمحوں کے لیے وُہ سب کچھ بھول جاتا۔

ایک رات شہزادے نے خواب میں درویش بابا کو دیکھا۔ بابا کو دیکھتے ہی وُہ اُن کے

دامن سے لپٹ گیا اور اشکوں سے اُن کا دامن تر کر دیا۔ درویش بابا نے اُسے اپنے گلے سے لگایا اور اُس کے اشک پونچھے۔ شہزادے نے اُنہیں بتایا کہ وُہ جس غزال پر مرمٹا ہے وُہ انسان نہیں ایک پَری ہے۔ اُس نے اُنہیں بتایا کہ اُسے اِس کھوہ میں رہتے ہَوئے نجانے کتنا عرصہ ہَو گیا ہے لیکن وُہ اب بھی اُس ماہ جمال سے صدیوں کی دُوری پَر کھڑا ہے۔

درویش بابا نے اُسے بتایا کہ آئندہ جب وُہ پَری اپنی سہیلیوں کے ہمراہ جھیل پَر نہانے اُترے گی تو وُہ اپنی پوشاک اُتار کر سب سے پہلے زمین پر رکھے گی اور اُس کے ایسا کرنے کے بعد اُس کی سہیلیاں بھی اپنی اپنی پوشاکیں اُتار کر اُس کی تہہ کی ہَوئی پوشاک پَر رکھ دیں گی۔ جب وُہ سب جھیل میں نہانے اُتر جائیں اور اپنے گردوپیش سے غافل ہَو جائیں تو تُم چپکے سے پَری کی پوشاک اپنے قبضے میں کر لینا اور پھر کسی صورت اُسے اُس کی پوشاک واپس نہ کرنا۔ البتہ تن ڈھانپنے کے لیے تُم اُسے اپنی کوئی چادر وغیرہ ضرور دے دینا۔

درویش بابا نے اُسے بتایا کہ نیچے وادی میں جہاں اُس کے سپاہیوں نے خیمے لگائے تھے وہاں ایک دن ایک شہر آباد ہَو جائے گا۔ اس شہر کو دیکھنے کے لیے دنیا کے ہر مُلک سے سیاح یہاں کھنچے آئیں گے اور تُمہاری محبت کی داستان رہتی دنیا تک سنی اور سنائی جائے گی۔ اور وُہ سپاہی جو تُم نے راستے میں چھوڑے تھے، وُہ اردگرد کے علاقوں میں پھیل جائیں گے اور اُن کی آنے والی نسلیں اِن علاقوں میں راج کریں گی۔ یہ سنتے ہی شہزادے کی آنکھ کھل گئی۔ باہر ہر طرف دُھوپ پھیلی ہَوئی تھی۔

شہزادہ کھوہ سے نکلا اور جھیل کنارے اُس جگہ جا بیٹھا جہاں پریاں نہانے سے پہلے اپنی پوشاکیں اتار کر رکھتی تھیں۔ وُہ وہاں دیر تک بیٹھا رہا۔ درویش بابا سے خواب میں ملاقات

کے بعد شہزادے کو زندگی اب پھر سے بھلی لگنے لگی تھی۔ وُہ جھیل کے کنارے بیٹھا اپنی ہی دُھن میں گنگنا رہا تھا۔

دُھند، جنگل، برف، بادل
بولتی خاموشیاں
آسماں پانی کے اندر
دُور تک اُترا ہُوا
جھیل کے چاروں طرف
خودرو گلابوں کی مہک
بیچ میں اک آئینہ
اور آئینے میں اک دھنک
کوہساروں سے اُترتی
صبح کی پہلی کرن
دیوتاؤں کا تبسم
دیوتاؤں کا سخن
پھول کی آغوش میں
شبنم کا پاکیزہ بدن
قاف کی پریوں کی باہم
نرم سی سرگوشیاں
دُور سے آئی ہوئی پریاں

اور اُن کی گفتگو

اک پہاڑی گیت کے

معصوم جذبے کی طرح

میں اُسے محسوس کر کے

دیر تک کھویا رہا۔

بارے ایک بار پھر، چودھویں کا چاند مشرق کی جانب سے ایک نوکیلے پہاڑ (ملکہ پربت) کے عقب سے بلند ہُوا اور آہستہ آہستہ مغرب کی سمت اوپر اٹھنے لگا۔ آج شہزادے کی بے قراری دیدنی تھی۔ اِس دن کے لیے اُس نے برسوں تنہائی کا عذاب جھیلا تھا۔ ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر کی صعوبتیں ہنس کھیل کر برداشت کی تھیں اور موت کو کئی بار جُل دے کر صاف نکل گیا تھا۔ اپنا گھر بار تج دیا تھا اور اپنے بوڑھے باپ کو اپنی جدائی کے جاں لیوا صدمے سے دوچار کیا تھا۔ اُس پَری کے قدموں میں رہنے کی آرزو میں تخت و تاج کو ٹھکرا دیا تھا۔ جانے کتنی مدت سے اُس نے کسی انسان کی آواز تک نہ سنی تھی۔

رات آہستہ آہستہ بھیگتی جا رہی تھی۔ چاند اب جھیل کے اوپر بالکل جیسے معلق سا ہو گیا تھا۔ شہزادہ پتھر کی اوٹ میں بُت بنا بیٹھا تھا۔ ٹھنڈی برفیلی ہَوائیں اُس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھیں مگر وُہ دُور آسمان پر نظریں گاڑے اُس اپسرا کی آمد کا منتظر تھا جس نے اُسے اپنا نام بدیع الجمال بتایا تھا۔

اچانک اُسے بہت دُور آسمان پر چند نقطے سے دکھائی دیئے جو دھیرے دھیرے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ شہزادے نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ پھر ہر طرف وہی مانوس سی مہک پھیل گئی۔ یہ بدیع الجمال کی آمد کا واضح اشارہ تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جھیل پر بدیع الجمال اور اُس کی سہیلیوں کے قہقہے گونجنے لگے۔ پریاں بات بے بات ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہَو رہی تھیں۔ دیر تک یہی سلسلہ جاری

رہا۔ پھر بدیع الجمال نے اپنی پوشاک اُتاری اور تہہ کر کے زمین پر رکھ دی۔ اُس کی سکھیوں نے بھی اُس کی دیکھا دیکھی اپنی اپنی پوشاکیں اُتاریں اور بدیع الجمال کی پوشاک پر رکھتی چلی گئیں۔ چند ہی لمحوں بعد جھیل کے پانی میں ایک بار پھر آگ بھڑکنے لگی۔

شہزادہ پتھر کی اوٹ سے نکلا، دبے پاؤں تہہ کی ہوئی پوشاکوں کے پاس آیا اور سب سے نیچے پڑی ہوئی پوشاک کو بغل میں داب کر پھر اُسی پتھر کی اوٹ میں جا بیٹھا۔ خوشی اور ایک انجانے خوف کے سنگم پر کھڑے سیف الملوک کو اپنا دل اپنے سارے بدن میں دھڑکتا ہُوا محسوس ہَو رہا تھا اور اُس کی آنکھیں گویا اُس کی اُنگلیوں کی پوروں میں جڑی ہوئی تھیں، جن سے وُہ اُس پری کی پوشاک کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ چیزوں کو چھو کے بھی دیکھا جا سکتا ہے یہ تجربہ اسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ وہ پری کی پوشاک کو کبھی آنکھوں سے لگاتا کبھی بوسہ دیتا۔

پریاں دیر تک اُس سیال آگ میں نہاتی رہیں۔ جب جی بھر گیا تو سب سے پہلے بدیع الجمال جھیل سے باہر نکلی۔ تہہ کی ہوئی پوشاکیں ایک ایک کر کے پھر سے پہنی جانے لگیں لیکن بدیع الجمال کی پوشاک غائب تھی۔ پریوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بدیع الجمال غصے اور شرم سے تھر تھر کانپنے لگی۔ شہزادہ پتھر کی اوٹ سے نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہُوا جھیل کے کنارے پریوں کے قریب آ کھڑا ہُوا۔ شہزادے کو دیکھتے ہی پریوں نے اپنے پنکھ پھیلائے اور فضا میں بلند ہَونے لگیں۔ اب جھیل پر بدیع الجمال اور شہزادہ سیف الملوک کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔

بدیع الجمال نے اپنے برہنہ بدن کو اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اُس کا چھلکتا ہُوا بدن کسی طور اُس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ شرم و حیا سے وُہ گٹھڑی سی بن کر زمین

پر بیٹھ گئی۔ اُس کے برہنہ بدن سے سات رنگوں کی دھنک اور وُہی مانوس مہک پھوٹ رہی تھی۔ شہزادہ سیف الملوک نے اپنے بدن کے گرد لپٹی چادر اُتار کر بدیع الجمال کے سامنے رکھ دی۔

''مجھے میری اپنی پوشاک چاہیے۔'' بدیع الجمال کی نقرئی آواز ابھری۔

''تُم جانتی ہَو، اِس دن کے لیے میں نے کتنے جتن کیے ہیں۔'' شہزادے کے لہجے میں التجا کا رنگ نمایاں تھا۔

''جانتی ہُوں لیکن۔۔۔۔۔'' بدیع الجمال کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''لیکن کیا؟''

''وُہ ہم دونوں کو مار ڈالے گا۔'' بدیع الجمال کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزاں تھے۔

''وُہ کون؟''

''دیو سفید، وُہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''اور تُم؟''

''مجھے اُس سے نفرت ہے۔''

''تَو پھر؟''

''لیکن میں تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ دیکھو! پوشاک واپس کر دو ورنہ ہمیں بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملے گا اور اگر ہم بھاگنے میں کامیاب ہَو بھی گئے تَو تب بھی وُہ تحت الثریٰ تک ہمارا پیچھا کرے گا۔''

بدیع الجمال نے شہزادے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

’’مجھے تمہارے سنگ موت بھی منظور ہے لیکن اب میں تُم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔‘‘

شہزادے کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

’’پھر سوچ لو!‘‘

’’اگر تُم ہزار بار بھی پوچھو گی، میں ہزار بار یہی جواب دوں گا۔‘‘

بدیع الجمال نے ایک نظر شہزادے کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور اُس کے دل میں مچلتے جذبوں کو ٹٹولا اور پھر شہزادے کی دی ہُوئی چادر سے اپنا بدن ڈھانپتے ہَوئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ کہے بنا شہزادے کا ہاتھ تھام لیا۔ شہزادے نے اُس کی اُنگلیوں میں اپنی اُنگلیاں پیوست کیں اور پھر وُہ دونوں دوڑتے ہوئے شہزادے کی کھوہ میں داخل ہَو گئے۔

کوہ قاف کے شہرِ سبز میں ہیرے جواہرات سے بنی ایک چٹان سے پہلو لگائے دیو سفید پریوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔اُس کے پاؤں چاندی کی ایک وسیع و عریض معلق طشتری پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ نیچے ایک گہری کھائی تھی جس میں جن بُھوت خون کی بارش میں نہا رہے تھے۔ دیو کے ایک ہاتھ میں سونے کا ایک بڑا گرز تھا جس سے خود بخود طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جگہ جگہ سونے چاندی اور زر و جواہر کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے جن میں از خود تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ایک طرف کھوپڑیوں سے بنی ہوئی ایک دیوار تھی جس کے سائے میں پری زاد بوس و کنار میں مصروف تھے۔ سونے سے بنے ہوئے ایک منقش میدان میں کئی دیو ایک تخت کے اردگرد دوزانو بیٹھے تھے۔ فضا میں ہزاروں طشتریاں اُڑتی پھر رہی تھیں۔ گاہے گاہے ان میں سے کوئی طشتری زمین سے ٹکراتی ،ایک شعلہ سا بلند ہوتا اور بس۔ پری زادوں کی ایک ٹولی پانی سے بھرے ہُوئے تالاب میں مسلسل پھول پھینکے جا رہی تھی۔ یہ پھول پانی کی سطح سے چھوتے ہی ستاروں کی شکل اختیار کر لیتے تھے اور سونے سے بنے منقش میدان پر آ کر پل دو پل چمکتے اور پھر دوبارہ پھول بن جاتے۔ دُور ایک جلتے درخت کے نیچے مسہری پر نیم دراز ایک پری اِن پھولوں کو ستارے اور ستاروں کو پھول بنتے دیکھ کر زیرِ لب مسکرائے جا رہی تھی کیونکہ اِن پری زادوں کی یہ ساری محنت مشقت اُسی کو حاصل کرنے کے لیے تھی۔ پری اپنے بَر کے انتخاب کے لیے اِن پری زادوں کی آنکھوں ہی آنکھوں میں جانچ پرکھ کر رہی تھی۔ جن

بھوت اور پریاں اپنے اپنے کام میں لگے ہُوئے تھے۔

ادھر ترائی میں ایک گہرا کنواں تھا جس سے عجیب ہولناک آوازیں ابھر رہی تھیں۔سبھی جانتے تھے کہ اس کنویں میں وہ وحشی قید ہیں جنھیں اگر آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کے شر سے کوئی بھی محفوظ نہ رہے۔کالی بلا اس کنویں کی منڈیر پر پہرہ دے رہی تھی۔کالی بلا کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ کبھی کبھی غصے میں آ کر اپنا ایک ہاتھ کنویں میں ڈالتی، کسی وحشی کو گردن سے پکڑتی اور ایک جھٹکے سے پھر کنویں میں پھینک دیتی۔

کنویں سے ذرا سا ہٹ کر ایک چھوٹا سے میدان تھا جس میں ہر طرف گھاس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔میدان کے کنارے پر پھولوں کی کیاریاں اور درمیان میں درختوں کا جھنڈ تھا۔درختوں کے سائے میں ایک چشمہ تھا جس کے ارد گرد ایک اور طرح کا میلہ لگا ہوا تھا۔یہ وہ خوش نصیب تھے جنھیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی کہ وہ شاہِ جنات کے چہیتے تھے۔

اس میدان کے بالکل عقب میں شاہِ جنات کا محل تھا۔محل کیا تھا، ایک پوری دنیا تھی۔محل کے صدر دروازے پر جنات ہاتھوں میں کئی کئی گز لمبی آتشی تلواریں لیے پہرہ دے رہے تھے۔ہر دریچے کے سامنے ایک دیو اپنی ساری ہیبت کے ساتھ موجود تھا جس کا کام ہر آتے جاتے ہوئے پر نظر رکھنا تھا۔کسی کی کیا مجال کہ اس محل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔محل کا صدر دروازہ اتنا بلند تھا کہ اس کے آخری سرے تک نظر ہی نہیں پہنچتی تھی۔صدر دروازہ ایک راہداری میں کھلتا تھا جس کی دیواریں سونے سے بنی ہوئی تھیں ۔دیواروں پر ان بادشاہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن کی کبھی یہاں حکومت رہی تھی۔کئی میل تک بنی ہوئی اس راہداری میں خوب صورت اور جوان پریاں ہاتھوں میں مشعلیں لیے

ادھر سے ادھر گھومتی پھرتی تھیں۔

راہداری کے اختتام پر ایک وسیع و عریض باغ تھا، ایسا باغ کہ جس میں ہر وقت بہار رہتی تھی۔ زندگی سے بھرپور اس باغ میں ہر وہ سہولت اور سامانِ عیش و نشاط میسر تھا جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ باغ کے اس پار شاہِ جنات کا دربار تھا اور اس سے ملحق ایک بڑی رہائش گاہ جس میں شاہِ جنات اور اس کے اہلِ خانہ رہتے تھے۔

محل کے عقب میں ایک پہاڑ تھا جس کی آڑھی ترچھی چٹانوں پر طرح طرح کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ کہیں جنوں اور پریوں، کہیں جنگلی درندوں، کہیں پرندوں اور جانوروں کی تصاویر سے مزین اس پہاڑ پر بھی کئی جن پہرہ دے رہے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ پر بہت پہلے ایک بزرگ جن کا مسکن تھا۔ پہاڑ کی ایک کھوہ میں اس بزرگ جن نے کئی سال بسر کیے گویا ایک طرح کا مراقبہ کیا جس کے نتیجے میں اسے ایسی قوت ملی جو اس سے پہلے کسی کو بھی نہیں ملی تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس پہاڑ پر بنی ہوئی یہ ساری تصاویر اسی بزرگ جن کی بنائی ہوئی ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ بزرگ جن اپنے لڑکپن میں کسی شہزادی پر مرمٹا تھا۔ اس شہزادی کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ کوہ و بن سے نکلتا اور وہاں پہنچ جاتا جہاں شہزادی رہتی تھی۔ ایک مدت تک وہ بس اسے دیکھنے جاتا رہا لیکن پھر اس کے من میں اظہار کی وحشت جاگ اٹھی اور اس نے اپنے آپ کو اس شہزادی پر ظاہر کر دیا۔ جن کو دیکھتے ہی شہزادی بے ہوش ہو گئی اور اس عالم میں اسے کئی روز گزر گئے۔ محل کا سارا سکون غارت ہو گیا اور شہزادی کے ماں باپ پر ایک قیامت گزر گئی۔ ابھی اس جن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن شہزادی کے عشق نے اس کی اچھی خاصی تہذیب کر دی تھی۔ وہ جب بے ہوش شہزادی اور اس کے ماں باپ کو

دیکھتا تو اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آتا کہ آخر اس نے اس کم سن شہزدای سے اظہارِ عشق کرنے کی حماقت کیوں کی۔

جس دن شہزادی کو ہوش آیا اس دن کے بعد اس جن نے انسانوں کی بستیوں کی طرف آنا جانا ترک کر دیا اور اپنی دنیا بھی تیاگ دی۔ وہ سیدھا اس پہاڑ پر پہنچا اور ایک کھوہ میں جا بیٹھا اور ایسا بیٹھا کہ اسے اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ اس کے ساتھی جن اس کے پاس آتے، اسے سمجھاتے لیکن اس پر کسی کی کوئی بات اثر ہی نہ کرتی۔ احساسِ جرم نے اسے اندر سے گھائل کر دیا تھا اور وہ ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا جس کا کوئی چارا نہیں تھا۔

اس دوران میں قدرت اس پر مہربان ہوئی اور ایک فقیر وہاں آ پہنچا، یوں اس جن کی دنیا ہی بدل گئی۔ جن نے سارا ماجرا اس فقیر کو سنایا اور فقیر نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں لہرایا تو اس پر اس شہزادی کی شبیہ ابھر آئی۔ جن دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ فقیر نے اسے تسلی دی اور کہا کہ شہزادی کی اس شبیہ کو اپنے سامنے والی چٹان پر اتار لو۔ اس نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا کہ مجھے یہ ہنر نہیں آتا۔ فقیر نے کہا کہ محبت نے تمھارے تخلیقی سوتوں کو جلا بخش دی ہے اور یہ محبت ہی کر سکتی ہے۔ جن نے شہزادی کی شبیہ ایک ابھری ہوئی چٹان پر اتاری اور اس کے سامنے بیٹھ کر دیر تک روتا رہا۔ پھر تو وہ چٹانوں کے کینوس پر دن رات تصاویر بناتا رہتا تھا۔ اس نے ایک چٹان پر اپنے احساسِ جرم کو بھی پینٹ کیا تھا۔ اس تصویر میں اس نے آگ کے شعلوں پر اپنے چہرے کے نقوش بنائے تھے۔

کہتے ہیں کہ وقت گزرتا رہا اور پتھر پہ بنائی ہوئی آگ نے رفتہ رفتہ اس کے چہرے کو پتھر پہ نمایاں کرنا شروع کر دیا اور پھر یوں ہوا کہ ایک رات اسے ایک آواز سنائی دی۔ وہ اپنی کھوہ سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ یہ آواز پتھر پہ بنی ہوئی تصویر سے آ رہی تھی۔

پھراس نے شہزادی کی تصویر کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور پھر سارا پہاڑ بولنے لگا۔ پرندے، جانور سبھی بول رہے تھے اور اس جن پہ وحشت سی طاری ہو رہی تھی۔ وہ بہت گھبرا گیا تھا کہ اچانک وہ فقیر ایک بار پھر اس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ کہتے ہیں اسی فقیر کی دعا سے جن کو بزرگی بھی ملی اور وہ قوت بھی جس کے سبب اس نے ایک نئی دنیا بسائی۔ اس نے اس دنیا کو نیکی اور خیر کے رنگوں سے سجایا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ رنگ پھیکے پڑتے گئے۔ جب اس نے محسوس کیا کہ یہاں رہ کر اس کے وجود میں ابلتے تخلیقی سر چشمے سوکھ جائیں گے تو اس نے یہاں سے کوچ کا ارادہ کر لیا۔

وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے پہاڑوں کے درمیان ایک جھیل کے مغربی کنارے پر بنی ہوئی کھوہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس نے اس کھوہ کو مزین کیا، اس کی دیواروں پر تصویریں بنائیں اور اس کھوہ کے دوسرے سرے کو وادی میں بہنے والے دریا سے ملا دیا۔ اس کے بعد اس پر کیا گزری اس بارے میں کسی کو کچھ بھی علم نہیں۔

اس رات شاہِ جنات کے محل میں بزم سجی ہوئی تھی کہ یہ چودھویں کی رات تھی۔ لاکھوں کروڑوں ستاروں کی محفل میں جب پورا چاند آ نکلتا تھا تو سب پر وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی وہ رات تھی جب کسی پر کسی طرح کی کوئی قدغن نہ ہوتی تھی، جو چاہے محل میں جا سکتا تھا اور جس طرح چاہے اس بزم سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

شاہِ جنات اور اس کے اہلِ خانہ اپنی اپنی مسندوں پر پوری تمکنت سے بیٹھے ہوئے تھے اور نیم عریاں پریاں ہاتھوں میں شراب کے جام لیے سب کو دعوتِ مے نوشی دے رہی تھیں۔ کچھ پریاں بلوریں فرش پر اس ادا سے رقص میں مصروف تھیں کہ ان کے پاؤں کی گردش سے ان کے جسم لچک لچک جاتے تھے اور ان پر نگاہ نہ ٹکتی تھی۔ موسیقی کی ہلکی

ہلکی آواز پر جب پریاں اپنے جسم کو بل دے کر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتی تھیں تو ستارے ان کی انگلیوں کی پوروں پر چمکنے لگتے تھے اور چاند کی کرنیں ان کے نیم عریاں جسموں سے ٹکرا کر پنڈال میں بیٹھے ہوئے مست جنوں اور دیووں کی آنکھوں میں گھستی تھیں تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔

شاہِ جنات کی آنکھوں کی چمک سے ایسا لگتا تھا جیسے پریاں فرش پر نہیں اس کے سینے پر رقص کر رہی ہیں۔ اس کے دل کی دھڑکن دور سے سنائی دے رہی تھی جس میں پریوں کے لچکتے جسموں کی تال پر زیر و بم پڑ رہے تھے۔ اس کا سینہ ممکنہ حد تک پھیل کر سکڑتا اور پھر پھیلتا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کبھی سختی سے آپس میں پیوست ہو جاتیں تو کبھی ایسے مڑ جاتیں جیسے اسے تشنج کی بیماری ہو۔

ملکہ تو خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن شہزادیاں بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں بعد شہزادیاں بھی بلوریں فرش پر تھرک رہی تھیں۔ موسیقی کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی پنڈال میں شور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ محل کے اندر کھلے آسمان تلے، پورے چاند کی روشنی اور جلتے بجھتے قمقموں کی دودھیا لَو میں سارا پنڈال اب ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

سب سے الگ تھلگ چٹان سے پہلو ٹکائے دیو سفید، بدیع الجمال کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آج اُس نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ غصے میں بھرا ہُوا دیو سفید اپنی جگہ سے اُٹھا اور زر و جواہر سے بنی ایک چٹان کو اپنے سر سے بلند کر کے نیچے کھائی میں پھینک دیا۔ ابھی اُس نے ایک دوسری چٹان کو پہاڑ سے جدا کرنے کے لیے اُس پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی اَوٹ سے پریوں کی ایک ٹولی نمودار ہُوئی۔ دیو سفید نے غیظ

بھری نظروں سے پریوں کی طرف دیکھا اور پھر وُہ چونک گیا۔اُس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

’’بدیع الجمال کہاں ہے؟‘‘اُس کی آواز سے جیسے زلزلہ سا آ گیا۔پریوں کے چہروں پر خوف پھیلا ہوا تھا،کسی کی زبان سے کوئی لفظ تک نہ نکلا،سب سر جھکائے کھڑی رہیں۔دیو سفید نے ایک بار پھر ان سے یہی سوال کیا۔

’’جھیل پر اُس کا لباس ایک آدم زاد نے چُرا لیا ہے۔‘‘ایک پری نے ہمت کر کے جواب دیا۔

’’آدم زاد؟ اُس ناجنس کی یہ ہمت ! میں اُسے نیست و نابود کر دوں گا۔‘‘ دیو سفید چلانے لگا۔اُس کی آواز سن کر شہر سبز کے باسی اُس کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔دیو سفید کا قریبی دوست کالا عفریت اُس کی آواز سن کر دوڑا دوڑا آیا۔

’’کیا ہوا؟ کیا ہوا؟‘‘ کالا عفریت دھاڑا۔

اس کی بھدی آواز شہرِ سبز کے در و دیوار سے ٹکرائی۔جب اسے بتایا گیا کہ جھیل پر بدیع الجمال کا لباس ایک آدم زاد نے چرا لیا ہے تو اس نے اپنا گریبان پھاڑ لیا۔پھر اس نے دیو سفید کا گریبان پکڑ لیا اور چیخنے لگا۔

’’تم پھر بھی یہیں ہو؟نہیں نہیں،تم نہیں میں جاؤں گا۔میں جو ہر چیز کو تہس نہس کر دیتا ہوں۔میں جو پہاڑوں کو راکھ بنا دیتا ہوں ۔میں جس کی ایک پھونک سے زلزلہ آ جاتا ہے۔‘‘

کالا عفریت چلا رہا تھا اور اس طرح اچھل رہا تھا کہ ہر چیز لرز رہی تھی۔

اِسی اثنا میں یہ خبر شاہِ جنات تک پہنچ گئی اور سجی سجائی بزم جو اپنے جوبن پر تھی اچانک

برہم ہوگئی۔ رقص تھم گیا، شراب کے جام الٹ دیے گئے، جسموں میں ہیجان پیدا کرنے والی موسیقی پر جان لیوا سناٹے نے پردہ ڈال دیا، پریاں پنڈال کے کونے میں سمٹ کر اپنے نیم برہنہ جسموں کو سہلانے لگیں، پری زاد، جن اور دیو اپنی اپنی تشنگی لیے پنڈال سے باہر نکل گئے اور ہر سو خاموشی چھا گئی۔

شاہِ جنات نے فوراً دیو سفید کو اپنے حضور طلب کر لیا۔ دیو نے سارا ماجرا شاہِ جنات کے گوش گزار کیا۔ ایک آدم زاد کی اِس جسارت پر شاہِ جنات آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے ایک ہزار جن اور دیو شہزادہ سیف الملوک کو لانے کے لیے بھیجنے کا حکم دیا اور کہا کہ اس آدم زاد کو یہاں لا کر اس کنویں میں قید کر دیا جائے جس میں سرکش جن اور دیو بند ہیں اور اس پر ایک نہیں کئی عفریت چھوڑ دیے جائیں تا کہ آئندہ کسی آدم زاد کی یہ جرات نہ ہو کہ وہ کسی پری سے عشق کرے مگر دیو سفید نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ وُہ اکیلا ہی اُس آدم زاد سے اپنا انتقام لینا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وُہ اپنے دوست کالے عفریت کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا۔

شاہِ جنات نے اس کی التجا سنی اور کہا:

''پھر بھی میرا خیال ہے کہ تم طلسمی کنویں میں جھانک کر یہ دیکھ لو کہ باغی بدیع الجمال اور وہ سر پھرا عاشق، وہ ناجنس اس وقت کہاں پائے جاتے ہیں۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر مجھے اپنی طاقت پر بڑا یقین ہے، میں ان دونوں کو پاتال سے بھی باہر کھینچ نکالوں گا۔''

دیو سفید نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

شاہِ جنات نے چند لمحے اُس کی درخواست پر غور کیا اور پھر دیو سفید کو اِس شرط پر یہ اجازت دے دی کہ اگر وُہ اُس آدم زاد کو زندہ یا مردہ کوہ قاف لانے میں ناکام رہا تو وُہ خود بھی واپس یہاں نہیں آئے گا۔

شاہِ جنات کو دیو سفید پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس نے شاہِ جنات کی بات نہیں مانی تھی لیکن شاہِ جنات اسے موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک دیو ایک معمولی انسان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے۔شاہِ جنات کو یقین تھا کہ دیو سفید اس ناجنس کو پکڑ کر اس کے سامنے ضرور لے آئے گا۔

دیو سفید نے شاہِ جنات کی یہ شرط قبول کر لی اور پیر پٹختا ہُوا دربار سے باہر نکل گیا۔شاہِ جنات اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کے جانے کے بعد بھی وہ اپنی نشست پر تنہا بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ دنیا کتنی بدل گئی ہے۔وہی انسان جو کبھی جنات کی ہیبت سے خوف کھاتا تھا اب اس کی خلوتوں میں گھس آیا تھا اور اسے بات کی بھی کوئی پروا نہیں کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔

’’میں بہت پہلے سے جانتا ہوں کہ بدیع الجمال ایک ناجنس کی محبت میں گرفتار ہے۔‘‘

مستارجن نے قہقہہ لگایااور پیڑ سے سیب کی شکل کا ایک پھل اتار کا منہ میں ڈال لیا۔

''واقعی؟''اس کے ساتھی نے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

''سچ کہتا ہوں، میں نے اسے اپنی آنکھوں سے اس آدم زاد کے ساتھ دیکھا تھا۔''مستارجن نے جواب دیا۔

''کب؟''اس کے ساتھی نے پوچھا۔

''وہ ایک تاریک رات تھی، میں ویرانوں میں گھوم رہا تھا کہ اچانک میں نے بدیع الجمال کو ایک آدم زاد کے ساتھ اکھٹے دیکھا۔''

مستارجن نے اپنے ساتھی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھرتم نے کیا کیا؟''

''بدیع الجمال کوایک ناجنس کے ساتھ دیکھ کر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا مگراس وقت میں نے ان دونوں کو کچھ بھی نہ کہا۔''

مستارجن نے کہا۔

''کیوں؟تمہیں چاہیے تھا کہ تم ان دونوں کو جان سے ماردیتے۔''اس کے ساتھی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں ایسا ہی کرنے لگا تھا مگر اُسی لمحے مجھے اپنی کانچی یاد آ گئی۔''مستارجن کی آنکھوں میں ایک عجیب سا رنگ آیااور کچھ لمحے اسے اسی حال میں گزر گئے۔

''مگر میں نے اس آدم زاد کا پیچھا کیا، میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔''مستار

جن نے کہا۔

''تو تمہیں پتا چلا کہ وہ کون ہے؟'' اس کے ساتھی نے پوچھا۔

''ہاں، وہ ایک شہزادہ ہے، باپ کا اکلوتا بیٹا۔ وہ اس خطے میں رہتا ہے جو خود بھی ایک طلسم کدہ ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے اپنی زندگی میں شہزادے جیسا جوانِ رعنا نہیں دیکھا۔ پھر بھی میں نے کئی بار ان کے باغات اجاڑے، فصلیں مسمار کیں، شہزادے کو زنجیروں میں جکڑا، اسے زخمی کیا، لیکن وہ تو بدیع الجمال کی محبت میں بالکل پاگل ہو گیا تھا جیسے میں کانچی کی محبت میں پاگل ہو گیا ہوں، پھر مجھے شہزادے پر رحم آ گیا۔''

مستار جن نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا، اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اس کے دل کا احوال بتا رہی تھی۔ وہ دیر تک ایک ہی سمت میں دیکھتا رہا۔ جانے وہ کچھ دیکھ بھی رہا تھا یا بس اپنے ساتھی سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ اس کا ساتھی اس کے دل کے حال سے بخوبی آگاہ تھا اس لیے وہ بھی چپ ہی رہا۔

''یار یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ اندر کی وحشت کو مار دیتی ہے۔ انسان ہوں یا ہم جن، یہ محبت سب پر ایک ہی طرح سے وار کرتی ہے۔''

مستار جن ایک بار پھر گویا ہوا۔ اس کے لہجے میں اس کے اندر کا دکھ بول رہا تھا۔

''پھر میں نے اس آدم زاد کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا، مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ میں نے یہ بات کوہِ قاف میں کسی کو نہیں بتائی، تم بھی اس

بارے میں خاموش ہی رہنا ورنہ میں مفت میں مارا جاؤں گا۔‘‘

مستار جن نے اپنے ساتھی سے کہا۔

’’اب ویسے بھی ایک لمبا کھیل شروع ہونے والا ہے۔اس شہزادے کو بھی کچھ ایسے لوگوں کی حمایت حاصل ہے جو علم و حکمت والے ہیں۔دیو سفید کا کیا بنے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔خاموشی ہی بہتر ہے۔‘‘

مستار جن نے ساری بات سے اپنے ساتھی کو آگاہ کیا اور اس سے وعدہ لیا کہ حالات چاہے کیسے بھی کیوں نہ ہوں وہ اپنی زبان نہیں کھولے گا۔دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر مستار جن نے کہا:

’’مجھے تو ایک خوف لاحق ہو گیا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ انسان، یہ ناجنس اپنے علم کے زور پر ہماری دنیا میں آ جائیں۔تمھیں کیا پتا کہ یہ علم کی طاقت کیا ہوتی ہے۔‘‘

’’کچھ بھی نہیں ہو گا، تم تو ڈر ہی گئے۔ویسے ایک بات ہے، کبھی اپنی محبت سے غافل نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس میں ناجنس گھس آتے ہیں۔‘‘

مستار جن کے ساتھی نے کہا تو مستار نے اسے حیرت سے دیکھا جیسے اسے اپنے ساتھی سے حکمت کی کسی ایسی بات کی کوئی توقع نہ تھی۔

☆

شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال جھیل کے کنارے بنی ہُوئی کھوہ میں چھپے ہُوئے تھے۔ پَری نے اب شہزادے کی پوشاک پہن رکھی تھی۔ وُہ اِس لباس میں خوب بَچ رہی تھی لیکن اُس کے چہرے پر مردنی چھائی ہُوئی تھی اور وُہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

''ہماری موت یقینی ہے۔'' پَری نے چہرے پر آئی ہوئی زلف کو جھٹک کر شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''دیو سفید تھوڑی ہی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہو گا۔ وُہ غصے میں کیا کچھ کر سکتا ہے تمہیں اِس کا اندازہ نہیں۔''

پَری کی آواز میں لرزش تھی۔

''وُہ اِس کھوہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر تُم ہمت کرو تو ہَم اِس تنگ راستے پر چل نکلیں۔ شاید اِس غار کا کوئی دوسرا دہانہ بھی ہَو۔''

شہزادے نے اپنے گلے میں پڑی ہُوئی مالا کو گھماتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔'' پَری نے غار کے دہانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شہزادے نے پَری کے ہاتھ کی پُشت پر بوسہ دیا اور اُس کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر غار کے تنگ ہوتے ہوئے راستے کی جانب بڑھنے لگا۔ دونوں کے قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ شہزادے کے گلے میں پڑی ہوئی مالا کے موتیوں کی روشنی میں کئی گُنا اضافہ ہو گیا تھا۔

☆

دیوسفید نے جھیل پر پہنچ کر بدیع الجمال کو تلاش کیا مگر وُہ اُسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اس نے پہاڑوں پر پڑی برف کی چادر کو ہٹا کر دیکھا، جھیل کے پانی کی تہہ میں اترا، ملکہ پربت پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے ان دونوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اچانک اُس کی نظر اُس پہاڑی کھوہ پر پڑی جس میں شہزادہ سیف الملوک اور بدیع الجمال نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس نے اس کھوہ میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کھوہ کا دہانہ اتنا تنگ تھا کہ اس کی محض ایک آنکھ ہی اس میں آسکی۔ غصے میں دیوسفید نے اُس کھوہ کے دہانے پر اپنے پاؤں سے ایک ضرب لگائی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ سارا پہاڑ کانپنے لگا۔ غصے میں بھرے ہوئے دیو کی آنکھوں میں دوزخ دہک رہا تھا۔

جب دیو کو اور کچھ نہ سوجھا تو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پہاڑ کو اکھیڑنا شروع کر دیا۔ دھرتی پر ایک زلزلہ سا آیا ہُوا تھا۔ دیو پہاڑوں کو کبھی اپنے پاؤں سے ٹھوکریں مار رہا تھا اور کبھی چٹانوں کو اکھیڑ اکھیڑ کر فضا میں اچھال رہا تھا۔ فضا میں ہر طرف گردوغبار پھیلا ہُوا تھا۔ جھیل کے شفاف پانی کی سطح پر گرد کی دبیز تہہ جم چکی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد دیو جھیل کے شمال مغرب میں ایستادہ پہاڑ کی چوٹی پر جا کھڑا ہُوا۔ یہاں سے اُس کے شیطانی ذہن کو ایک اور ترکیب سوجھی۔ اُس نے اپنے داہنے پاؤں سے جھیل کے سامنے والے پہاڑ پر ایک ضرب لگائی جس سے پہاڑ میں ایک بڑی دراڑ پڑ گئی۔ دوسری ضرب کے لگتے ہی قدرتی طور پر بنا ہُوا یہ بند ٹوٹ گیا اور بند کے

ٹوٹتے ہی پانی سیلاب کی صورت میں نیچے کی طرف بہنے لگا۔ دیو جانتا تھا کہ جھیل کے پانی کا یہ سیلابی ریلا وادی کو زیروزبر کر کے رکھ دے گا اور اس عالم میں کسی ذی روح کا زندہ بچ کر کہیں نکل جانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ پَری کی بے وفائی نے اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر وُہ اُس کی نہیں ہَو سکی تو کسی اور کا بھی اُس پر کوئی حق نہیں۔

اِس سے پہلے کہ پانی کا یہ ریلا نیچے وادی تک پہنچتا (جہاں اب ناراں کا قصبہ ہے) دیو سفید پہاڑ کی چوٹی پر اُس جگہ آ کھڑا ہُوا جہاں سے اُسے نیچے وادی صاف نظر آ رہی تھی، کہ اگر وُہ دونوں سیلابی ریلے سے بچنے کے لیے پہاڑ کی طرف آئیں تو وُہ انہیں اُن کے کیے کی سزا دینے کے لیے وہاں موجود ہو۔

شہزادہ سیف الملوک اور پَری بدیع الجمال اُس تنگ ہوتے راستے پر تھوڑا ہی آگے گئے ہوں گے کہ راستہ دھیرے دھیرے کشادہ ہونا شروع ہو گیا۔ اب اُن دونوں کو دوڑنے میں کوئی دُشواری نہیں ہَو رہی تھی۔ وُہ جلد سے جلد غار کے دوسرے دہانے پر پہنچ جانا چاہتے تھے لیکن ابھی اُنہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ غار کا کوئی دوسرا دہانہ ہے بھی یا نہیں۔ پھر بھی وُہ ایک موہوم سی امید پر تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اچانک پہاڑ لرزنا شروع ہو گیا۔ پَری رُک گئی۔

''شاید اُس نے پہاڑ کو اُکھاڑنا شروع کر دیا ہے۔'' وُہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''رُکنا مناسب نہیں، ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔'' شہزادے نے مشورہ دیا۔ بدیع الجمال

نے محبت بھری نظروں سے شہزادے کو دیکھا اور بولی:

''دیو اِس پہاڑ کو کھود کر ہمیں زندہ یا مردہ ہر حال میں ڈھونڈ نکالے گا۔ مرنے یا پکڑے جانے سے پہلے میں تمہیں جی بھر کر دیکھ لینا چاہتی ہوں۔ تُم سچے ہَو، تمہارا پیار سچا ہے۔''

پَری کے لہجے میں سمندر جیسی گہرائی تھی۔ شہزادے نے ایک نظر پَری کے سراپا پر ڈالی اور پھر وُہ اُس سے لپٹ گیا۔ وُہ پَری کے اور پَری اُس کے بوسوں میں نہا گئی۔

اچانک اُنہیں دُور غار کے کنارے پر روشنی دکھائی دی۔ شہزادے نے چیخ کر پَری کو اُدھر متوجہ کیا۔

''ہاں ! وہاں تمہاری محبت اور وفا میں گندھی ہُوئی زندگی ہماری منتظر ہے۔''

پَری نے اپنا ہاتھ شہزادے کے کاندھے پر رکھ دیا۔ ایک نئی اور سہانی زندگی کے تصور نے اُن دونوں کے انگ انگ میں بجلیاں سی بھر دیں اور اُن کی چال میں خود بخود تیزی آ گئی تھی۔ جب وُہ غار کے دہانے پر پہنچے تو وادی میں صبحِ صادق طلوع ہَو چکی تھی۔ وُہ غار سے باہر نکلے۔ سامنے آسمان سے باتیں کرتا ہُوا پہاڑ تھا جس کے دامن میں شور کرتا دریا بہہ رہا تھا۔ شہزادہ اِس جگہ سے بخوبی واقف تھا۔ اِس وادی میں داخل ہَونے کے لیے اُس کے قافلے نے یہیں سے دریا کو عبور کیا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ یہاں سے محض چند قدم کے فاصلے پر

اُس کے قافلے نے خیمے لگائے تھے اور اپنے ساتھ آئے ہُوئے آدھے سپاہیوں کو اُس نے یہیں خیمے لگا کر رہنے کی تاکید کی تھی۔

اُس کے قدم خود بخود اُس طرف اُٹھنے لگے جہاں اُس کے خیال میں اب بھی اُس کے سپاہی موجود تھے۔ وُہ اُسے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے اور پھر جب اُن کی نظر پَری پر پڑے گی تو اُن کی حالت دیدنی ہَو گی۔ وُہ انہی خیالوں میں غرق تھا کہ اچانک اُسے ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ کسی اچانک اُفتاد سے بچنے کے لیے اُس نے بدیع الجمال کا ہاتھ تھاما اور واپس غار کی طرف دوڑنے لگا۔ ابھی وُہ غار سے چند قدم دُور تھے کہ دریا میں طغیانی آ گئی۔ سورج نکل آیا تھا اور ساری وادی دھوپ میں نہا گئی تھی۔

دریا پل میں اتنا بپھر گیا کہ اُنہیں غار کا دہانہ کوسوں دُور دکھائی دینے لگا لیکن اُن دونوں نے ہمت نہ ہاری۔ وُہ پوری قوت سے غار کے دہانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ طغیانی میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہَوتا جا رہا تھا مگر وُہ آگے بڑھتے رہے۔ غار محض چند قدم دُور تھا کہ پانی کا ایک ریلا آیا۔ شہزادہ سیف الملوک پَری بدیع الجمال سے لپٹ گیا۔ پانی میں بڑے بڑے پتھر لڑھکنے کی وجہ سے عجیب طرح کی گھن گرج ہَو رہی تھی۔ جڑوں سے اُکھڑے ہوئے درخت خس وخاشاک کی صورت اُن کے قریب سے بہتے ہُوئے گزر رہے تھے۔ سامنے پہاڑ پر بدیع الجمال کو اچانک ایک طویل سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔

''دیو!'' وُہ چیخی۔

شہزادے نے ایک پل کے لیے اُس حرکت کرتے سائے کو خوف اور پھر غار کے دہانے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ موت ہر جانب منہ کھولے رقص کر رہی تھی۔ اِرد گرد کے ٹیلوں سے مٹی کے بڑے بڑے تودے ''جھپاک'' کی آواز کے ساتھ بڑھتے

ہُوئے سیلابی ریلے میں گر رہے تھے۔

دیو سفید اپنے پہاڑ جیسے جثّے سے درختوں کو روندتا ہُوا تیزی سے نیچے اُتر رہا تھا۔شہزادہ جانتا تھا کہ اگر انہیں غار تک پہنچنے میں ذراسی بھی دیر ہُوئی تو اُن کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔

پَری بدیع الجمال مسلسل بھاگتے بھاگتے پہلے ہی بہت نڈھال ہَو چکی تھی اوراب تو دیو کی دہشت نے اُس کے جسم سے رہی سہی توانائی بھی زائل کر دی تھی لیکن اُس نے دل ہی دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اُس کا جینا اور مرنا اب صرف سیف الملوک ہی کے لیے ہے۔

دفعتاً پانی کا ایک اور ریلا آیا اور شہزادے کے گلے میں پڑی ہوئی مالا پانی کے اِس ریلے سے ٹوٹ گئی اور اُس کے موتی دانہ دانہ ہَو کر سیلاب کی نذر ہَو گئے لیکن اِسی ریلے نے اُن دونوں کو اُٹھا کر غار کے دہانے پر پھینک دیا۔شہزادہ اور پَری اپنے شانوں تک پانی میں ڈوبے ہُوئے تھے۔غار کے دہانے پر دونوں طرف بڑی بڑی ترچھی پتھر کی سلیں دروازے کی شکل میں دُور تک اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔

جنوبی پتھر کا سہارا لے کر شہزادہ غار میں داخل ہونے میں کامیاب ہَو گیا۔اُس نے پتھر سے اپنی پُشت جوڑ کر بائیں ہاتھ سے پَری کو اپنی طرف کھینچ لیا۔پَری کے پاؤں زمین پر سے اُکھڑ چکے تھے سووُہ تقریباً تیرتی ہُوئی شہزادے کے سینے سے آ لگی۔یہاں پانی کی سطح نسبتاً کم تھی اِس لیے اب وُہ پھر سے پانی میں چلنے کے قابل ہَو گئے تھے۔

شہزادے نے اپنے بائیں ہاتھ میں پَری کا داہنا ہاتھ تھاما اور ایک مرتبہ پھر چلنا شروع کر دیا۔چند قدم چلنے کے بعد وُہ غار میں اپنی دائیں طرف مڑے اور اِس کے ساتھ ہی پانی کا ایک بڑا ریلا بھی غار میں داخل ہُوا۔

دیو سفید پہاڑ کی چوٹی پر سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے پری اور شہزادے کو اور ان کے پیچھے سیلابی ریلے کو غار میں جاتے دیکھا تو اُس کے سارے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا اور اسے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد وہ جب ذرا سنبھلا تو اس کی نگاہیں خود بخود ایک چھوٹی پہاڑی کے دامن میں بنے ہوئے غار کی طرف اٹھیں مگر وہاں تو پانی ہی پانی تھا۔ بدیع الجمال کی موت کے خیال نے دیو سفید کی ساری توانائیاں زائل کر دیں اور اس کی کانپتی ٹانگوں نے اس کے بدن کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور سیلاب کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سیلاب تھم گیا تو وہ پہاڑ سے نیچے اترا اور غار کے دہانے کے پاس آ کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے نام لے لے کر بدیع الجمال کو پکارا۔ اس کی آواز پہاڑوں سے ٹکراتی تو ساری وادی گونجنے لگتی مگر غار کے اندر سے اسے کوئی آہٹ، کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اسے لگا جیسے غار کے اندر کی تاریکی اس کے وجود میں بھر گئی ہے اور وہ جسے اپنی طاقت پر بہت زعم تھا، نامرادی کے پاتال میں گرتا چلا جا رہا ہے۔

کئی برس وادی میں مارا مارا پھرنے کے بعد ایک رات اس نے جھیل سیف الملوک کی راہ لی۔ وہ جب جھیل پر پہنچا تو چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نکلا ہوا تھا اور جھیل اس کی دودھیا چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر بدیع الجمال یاد آ رہی تھی۔ وہ اگر زندہ ہوتی تو آج اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھیل پر نہانے آتی۔ وہ انھی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک اسے پریوں کی ایک ٹولی دکھائی دی جو جھیل کے کنارے اتر رہی تھیں۔ اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ شاید ان میں بدیع الجمال بھی

ہو۔ وہ غور سے ان پریوں کو دیکھنے لگا لیکن ان نوخیز پریوں میں اسے بدیع الجمال نظر نہ آئی۔ پریاں اس کی موجودگی سے بے خبر ہنستی کھیلتی جھیل میں نہا رہی تھیں۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ بدیع الجمال ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ چکی تھی اور وہ اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو چکا تھا۔ اس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ کوہِ قاف سے اب بھی پریاں جھیل پر آتی تھیں اور یقیناً ان میں سے کوئی کسی کی بدیع الجمال بھی ہوگی۔ کوہِ قاف میں کوئی اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ میری جگہ اب اور کسی نے لے لی ہوگی۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، مجھ جیسے کئی دیو سفید آئے اور گئے مگر میں نے جو کچھ کیا وہ ناقابلِ معافی ہے۔

اس پر وحشت سی طاری ہوگئی تھی، اسی عالمِ وحشت میں وہ جھیل سیف الملوک کے مشرق میں دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کی اور نکل گیا۔ وہ پہاڑوں میں دیوانوں کی طرح گھومتا رہتا تھا اور اپنی پہلی اور آخری محبت بدیع الجمال کو یاد کر کے روتا رہتا تھا۔

احساسِ زیاں کے ساتھ اب احساسِ ندامت نے بھی اسے آن گھیرا تھا۔ کاش بدیع الجمال زندہ ہوتی، کاش میں نے خود پر قابو پایا ہوتا۔ احساسِ ندامت کا جانے وہ کیسا لمحہ تھا جب اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھری، اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک آنسو، اس کے گالوں کو بھگوتا ہوا زمین پر گرا۔ کہتے ہیں کہ اشکِ ندامت کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ جہاں اس کا آنسو گرا تھا وہاں ایک چھوٹی سی جھیل بن گئی جسے اب ''آنسو جھیل'' کہا جاتا ہے۔

وہ غار جس میں بدیع الجمال اور سیف الملوک داخل ہوئے تھے ناران کے قصبے میں اب بھی اپنے پورے طلسماتی وقار کے ساتھ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ سیف الملوک اور پَری بدیع الجمال اب بھی اِس غار میں کہیں موجود ہیں۔

کون جانے یہ بات کہاں تک سچ ہے لیکن جھیل سیف الملوک اور ناران کی فضاؤں میں اب بھی شہزادہ سیف الملوک کے سانسوں اور پَری بدیع الجمال کے بدن کی خوشبو رچی بسی ہُوئی ہے۔

انہی جھرنوں کے نغموں میں ہے پوشیدہ ہنسی اُس کی
جسے سن کر پہاڑی راستوں کے دل دھڑکتے ہیں
(احمد عطاء اللہ)